حیاتِ ازہریؒ

یعنی حضرت مولانا محبوب الرحمٰن صاحب ازہریؒ
سابق استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ و مدرسہ عالیہ کلکتہ کی

مختصر سوانح حیات

تالیف

مولانا قاری مفتی محمد مسعود عزیزی
رئیس مرکز احیاء الفکر الاسلامی، مظفر آباد، سہارنپور

ناشر

دار البحوث والنشر

مرکز احیاء الفکر الاسلامی، مظفر آباد، سہارنپور (یوپی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلسلہ مطبوعات مرکز احیاء الفکر الاسلامی.................................(۵۵)

نام کتاب: حیات ازہریؒ
تالیف: مولانا قاری مفتی محمد مسعود عزیزی
صفحات: ۱۶۰ر
تعداد: ۱۱۰۰ر
قیمت: ۱۰۰ر روپئے

سنہ اشاعت.................................. ۲۰۲۱ء مطابق ۱۴۴۳ھ
کمپوزنگ: عزیزی کمپیوٹر سینٹر مرکز احیاء الفکر الاسلامی

ناشر
دار البحوث والنشر
مرکز احیاء الفکر الاسلامی، مظفر آباد، سہارنپور (یوپی)
Mob: 09719831058
Email. masoodazizi94@gmail.com - www.mifiin.org

ملنے کے پتے

☆ دار الکتاب، دیوبند، سہارنپور (یوپی) ☆ نعیمیہ بک ڈپو، دیوبند سہارنپور
☆ مکتبہ ابوالحسن، محلّہ مفتی سہارنپور ☆ مکتبہ ندویہ، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
☆ اتحاد بک ڈپو، دیوبند، سہارنپور ☆ الفرقان نیا گاؤں مغربی (نظیر آباد) لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حیات ازہریؒ

باب در باب

باب اول: ولادت، وطن، خاندان، پس منظر اور تعلیم وتربیت

باب دوم: درس وتدریس، نگرانی، اور ندوۃ العلماء

باب سوم: مولانا کا طرز تدریس اور ان کے شاگرد

باب چہارم: دعوتی واصلاحی کوششیں اور باطل کے خلاف جدوجہد

باب پنجم: صفات وخصوصیات

باب ششم: مولانا کے معاصرین

باب ہفتم: مولانا ازہری اپنی تحریروں کے آئینے میں

باب ہشتم: تالیفات وتصنیفات

باب نہم: مولانا کی علالت اور وفات

باب دہم: باقیات صالحات

فہرست مضامین

مقدمہ: حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن فیضی ندوی ۱۳
پیش لفظ: ڈاکٹر محمد اکرم صاحب ندوی ۱۵
تقریظ: ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ۲۱
عرض مؤلف: محمد مسعود عزیزی ۲۵
تعارف صاحب کتاب: محمد عمران قاسمی ۲۷

باب اوّل

ولادت، وطن ، خاندان ، پس منظر اور تعلیم وتربیت

تمہید ۳۸
مولانا کی پیدائش ۳۹
مولانا کا وطن کیرانہ .... //
خاندان کا پس منظر ۴۰
تعلیم وتربیت ۴۶

باب دوم

درس وتدریس ، نگرانی اور ندوۃ العلماء

تمہید ۴۸
تدریس کا دور اول .... //
تدریس کا دور ثانی ۴۹
کلکتہ روانگی .... //

تدریس کا دورِ ثالث ۵۱
کامیاب مدرس ۵۲
عربی زبان وادب کا پاکیزہ ذوق ۵۳
علمی گہرائی ۵۴
قرآن کریم کا ذوق اور اس سلسلہ میں آپ کی کوششیں .... //
مولانا کی جامعیت ۵۵
ندویانہ مزاج کے حامل اور امین ۵۶
مولانا مرحوم اور دار العلوم ندوۃ العلماء .... //
ندوہ میں نگران اعلی ۵۸
مولانا مرحوم ایک مثالی نگراں تھے .... //
مولانا کے دفتر کے ملازم کا ایک واقعہ ۵۹
مولانا زبردست انتظامی صلاحیتوں سے مالا مال تھے ۶۰
مولانا کی نگرانی کے سلسلہ میں ایک فاضل کی شہادت .... //
تحریک ندوہ کے آئیڈیل ۶۱
بھٹکل میں مسلک شافعی کی رعایت ۶۲
کلکتہ اور ندوہ میں تدریس کی کل مدت .... //

باب سوم

مولانا کا طرز تدریس اور ان کے شاگرد

تمہید ۶۳
طلبہ اور اساتذہ میں محبوبیت .... //
ان کی تعلیم کا ذریعہ منفرد تھا ۶۴

عربی زبان کا طرز تدریس .... //
مولانا معلم کے ساتھ مربی بھی تھے ۶۵
مولانا مرحوم کے درس کی خصوصیات .... //
مولانا اپنے تلامذہ کی نگاہ میں ۶۶
مولانا کے مشہور تلامذہ پر اجمالی نظر ۶۸

باب چہارم

دعوتی واصلاحی کوششیں اور باطل کے خلاف جدوجہد

تمہید ۶۹
دعوتی واصلاحی کوششیں .... //
مولانا کے اصلاحی اور دعوتی کاموں میں مزاج نبوت کا عکس .... //
ردقادیانیت مولانا کی زندگی کا سب سے بڑا مشن ۷۰
فرق ضالہ کی تردید اور دفاع اسلام مولانا کا ن میدان تھا ۷۳
قادیانیت کی حماقت کم مائیگی اور بے عقلی .... //
جسمانی اور قلمی جہاد ۷۴
قادیانیت کا راست مطالعہ .... //
قادیانیت سے متعلق مولانا کی کوششوں پر ایک نظر ۷۵
قادیانیت سے متعلق مولانا کی سرگرمیاں ۷۶
سفر قادیان ایک تجزیاتی مطالعہ ۷۹
داعیانہ صفات ۸۰
قادیانیت پر کام کرنے کا صحیح طریقہ ۸۲
قادیانیت سے متعلق چند اہم حقائق .... //

مولانا کی کوششوں کے اثرات ۸۴
ردشیعیت ۸۵
شائستہ مباحثے ۸۶
مولانا موجودہ دور کی رسم جہیز کے خلاف تھے ۸۷
مولانا کا نکاح اور اس کی سادگی ۸۸
مولانا نے غلط رسم ورواج کو مٹانے میں پوری قوت صرف کردی ۸۹
آپ کے چار کارنامے ۹۰

باب پنجم

صفات اور خصوصیات

تمہید ۹۱
مولانا اسم بامسمّٰی تھے .... //
مولانا کی قوت ایمانی ۹۲
ان کی گفتگو سے عیادت کرنے والوں کے ایمان واطمینان میں اضافہ ہوتا تھا ... ۹۳
قرآن کریم سے تعلق وشغف .... //
زہدواستغناء ۹۴
سادگی ومروت .... //
صبرواستقلال ۹۵
حق گوئی وجرأت ایمانی .... //
اعتدال وتوازن ۹۶
مولانا کی سادگی اور تواضع ۹۷
مولانا ندوی زادہ اور ندوی گر تھے .... //

مولانا کے یہاں ضابطہ کا نفاذ تمام طلبہ پر یکساں ہوتا تھا ۹۸
بے لوث مخلص ومربی .... //
مولانا کی زندگی قابل تقلید.. ۹۹
مولانا فرشتہ صفت انسان تھے .... //
مولانا خود آگاہ وخدا شناس تھے.. ۱۰۰
مولانا کی سعادت مندی ۱۰۱
طلبہ واساتذہ کی مؤثر شخصیت.. //
مولانا کی سیرت وکردار کی تعمیر وشخصیت کی تشکیل میں تین بنیادی عوامل ۱۰۲
مولانا کی نمایاں تین خصوصیات.. //
امتیازی وصف ۱۰۳
عربی زبان وادب میں مہارت ۱۰۴
نام ونمود اور شہرت سے دور ۱۰۵
مولانا مرنجا مرنج طبیعت اور علمی مذاق کے حامل تھے ۱۰۶
مولانا اہل خاندان کی نظر میں.. //
بیٹی کے تأثرات ۱۰۷
بیٹے کے تأثرات ۱۰۸
بعض علماء کے تأثرات ۱۰۹

باب ششم

مولانا کے معاصرین حضرات

تمہید.. ۱۱۰
حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی .... //

حضرت مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی ۱۱۱
علامہ ابومحفوظ الکریم معصومی .... //
حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ۱۱۲

باب ہفتم

مولانا ازہری اپنی تحریروں کے آئینے میں

تمہید ۱۱۴
شر کو خیر کے توسط سے کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے ۱۱۵
مولانا کی تحریر کا طرۂ امتیاز ۱۱۶
اسلامی اخلاق کا ایک پیکر مجسم ۱۱۷
سوانح نگاری کا نمونہ ۱۱۸
تاریخ نویسی ۱۲۰
تبصرہ وتنقید ۱۲۱
علمی نکتہ سنجی ۱۲۳
دفاع اسلام ۱۲۵
اصلاح امت ۱۲۷
اچھی نثر کی خصوصیات ۱۲۹
مقصدیت ۱۳۰
جامعیت .... //
واضحیت ۱۳۱
صداقت ۱۳۲
بے ساختگی ۱۳۳

مولانا کی تحریر کی روشنی میں چند نمایاں اخلاقی اور دعوتی پہلو ۱۳۴

باب ہشتم

تالیفات وتصنیفات

تمہید ۱۳۶
قادیانیت کا مقابلہ اور مولانا ازہری ۱۳۷
قادیانیت کا مقابلہ اور اس کی سرکوبی ۱۳۸
سفر قادیان ۱۳۹
مولانا کے اس رسالہ کا اثر ۱۴۰
دروس الاشیاء والمحاروۃ العربیۃ .... //
مسجد اور مسلمان: حقائق وذمہ داریاں ۱۴۱
منتخبات العربیہ کا تجزیاتی مطالعہ .... //
آپ کے اہم اور قیمتی مضامین ۱۴۳
مدرسہ عالیہ کلکتہ ۱۴۴
شیعیت خود اپنے آئینے میں .... //
عبور قلزم یا نیل؟ ۱۴۵
بیان اللسان ڈکشنری پر تبصرہ .... //
بھاجپا سے ارتباط ۱۴۶

باب نہم

مولانا کی علالت اور وفات

علالت ۱۴۷
وفات .... //

باب دہم
باقیات صالحات

تمہید ۱۵۰
معنوی اور حقیقی اولاد ۱۵۱
ڈاکٹر سعید الرحمٰن فیضی ندوی ۱۵۲
خالد محبوب ۱۵۵
اسعد محبوب ۱۵۶
مولانا کی دو بیٹیاں ۱۵۹

مقدمہ

حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن فیضی ندوی

صدر الندوہ اسلامک سینٹر کناڈا

اس بات سے سبھی باخبر حضرات واقف ہیں کہ ہر زمانے میں اہل علم، اساتذہ ومربیین، دعاۃ ومصنفین، اہل قلم محققین، علماء ربانیین، مجاہدین فی سبیل اللہ، ناشرین رشد وہدایت، اہل اللہ کے احوال زندگی، انکی سیرت وسوانح، انکی دینی وعلمی خدمات، انکی تصنیفات وتحقیقات، انکی صفات وخصوصیات اور ان کے اصلاحی ودعوتی کارنامے قلم بند کرنے کا اہتمام رہا ہے، اور اس سلسلہ میں پورا ایک اسلامی کتب خانہ موجود ہے۔

بعض قلم کار مصنفین نے کسی ایک طبقہ کے ادباء ومحققین کے حالات تحریر کئے ہیں اور بعض نے کسی دوسرے کے، مثلاً کسی نے محدثین کے حالات لکھے، کسی نے مفسرین کے، کسی نے فقہاء کے، کسی نے ائمہ مجتہدین کے اور کسی نے ایک صدی کے ممتاز علماء ومصنفین کے احوال جمع کئے، اور کسی نے پہلی صدی سے لیکر اپنے زمانہ تک کے ممتاز اکابرین کے حالات کو جمع کیا ہے، اس طرح مختلف طبقات کی ممتاز شخصیات کا سراپا تاریخ وسیر کی کتابوں میں محفوظ ہے۔

پیش نظر کتاب: ''حیات ازہری'' جو میرے والد بزرگوار حضرت مولانا محبوب الرحمٰن ازہری سابق استاد دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ومدرسہ عالیہ کلکتہ کی سوانح حیات ہے، اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی اور اپنے موضوع پر ایک اہم کتاب اور سیرت وسوانح کے کتب خانہ میں ایک اہم اضافہ ہے، جس کو ہمارے عزیز محترم اور محبّ مکرم مولانا مفتی قاری محمد مسعود عزیزی ندوی نے بڑی محنت اور توجہ سے تحریر کیا ہے، مولانا کو اللہ تعالی نے تصنیف وتالیف کا خاص ذوق عطا کیا ہے، اور وہ مختلف دینی وعلمی موضوعات کے علاوہ سیرت

وسوانح کے موضوع پر بیس سے زیادہ کتابیں لکھ چکے ہیں،اس لئے ان کے قلم سے نکلی ہوئی یہ کتاب ان شاءاللہ قارئین کی دلچسپی اورانکی معلومات میں اضافہ کا باعث بنے گی۔

مولانا محترم اکتوبر ۲۰۱۷ء میں کناڈا تشریف لائے، انکی میزبانی اور خدمت کی اللہ تعالی نے توفیق دی، اس وقت والدمحترم کی سوانح حیات کے سلسلہ میں موصوف کے سامنے تذکرہ ہوا اوراپنی اس دلی خواہش کا اظہار ہوا، کہ والد ماجد کے حالات پرکوئی مستقل کتاب تحریر کی جائے ،مولانا نے اس مشورہ اور خیال کوعملی جامہ پہنانے کی ہاں بھرلی اور کناڈا سے واپسی پرانہوں نے کتاب کا خاکہ بنا کرکام شروع کردیا،اور یہ کتاب ''حیات ازہریؒ'' کے نام سے تحریر کردی، جواس وقت قارئین باتمکین کے سامنے ہے، یہ کتاب اگر چہ اسی وقت چند ماہ میں تیار ہوگئی تھی ،مگر بعض وجوہ کی بنا پراس کے منصۂ شہود پرآنے میں تاخیر ہوئی، کیونکہ ہر چیز کا اللہ تعالی کے یہاں ایک وقت متعین ہے،اس لئے اس سے پہلے کیسے ممکن ہوسکتا ہے، بہرحال اللہ تعالیٰ مولانا مسعودعزیزی صاحب کواجر عظیم عطافرمائے اوران کی اس خدمت جلیلہ کوقبول فرمائے۔

یہ تحریر راقم نے اپنے دلی جذبات اورشکریہ کے طور پرلکھی ہے، کیوں کہ کسی کا اپنے والد کے سلسلہ میں کچھ لکھنا بڑی آزمائش کی بات ہوتی ہے،اس لئے راقم والدصاحب کے سلسلہ میں کچھ بھی لکھنے کی بجائے صرف کتاب اورصاحب کتاب کےسلسلہ میں اسی قدرپر اکتفا کرتا ہے،مولانا مسعودعزیزی صاحب سے ایک خاص تعلق ہے،جس کی قدر کرتا ہوں،اوران کی اس قلمی کاوش پران کا بےحدممنون ومشکور ہوں،اللہ تبارک وتعالی انکی اس سعی کومشکور فرمائے، اور اس کتاب کوقبول فرمائے اور والدمحترم کے درجات کو بلند فرمائے،آمین۔ والسلام

سعیدالرحمٰن فیضی ندوی

صدرالندوہ اسلامک سینٹر کناڈا،

۴رستمبر ۲۰۲۱ء

پیش لفظ

مولانا ڈاکٹر محمد اکرم صاحب ندوی آکسفورڈ، برطانیہ

اس دنیا میں ہمیں کچھ چیزیں تیار شدہ ملتی ہیں، جیسے زندگی، حرارت، پانی، ہوا، پھل وغیرہ، جب کہ بہت سی اشیاء ہماری صلاحیتوں اور وسائل کے درمیان چھپی ہوتی ہیں، اور ہم انہیں حیز ظہور میں لاتے ہیں، مثلاً آسمان سے بنا بنایا گھر نہیں آتا، البتہ زمین میں وہ سارے اسباب وذرائع موجود ہیں، جن سے ہم گھر بنا سکتے ہیں، آگرہ میں کوئی تاج محل نہیں تھا، شاہجہاں نے اپنے وسائل کے بل پر یہ حیرت انگیز اعجوبہ تعمیر کیا، خلیفہ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زندگی پر کوئی معیاری کتاب نہیں تھی، علامہ شبلی نے متفرق مراجع سے مواد اکٹھا کیا، ان کا تجزیہ کیا اور اپنی سعی سے ''الفاروق'' تصنیف کر دی، اس طرح کی چیزیں وسائل وامکانات کے درمیان مخفی ہوتی ہیں، وہ انسانی کوششوں سے (جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے) کے مثل آشکارا ہوتی ہیں۔

ہم اپنی کوتاہی سے موجود کو معدوم سمجھتے ہیں، ہم شکایت کرتے ہیں کہ اس موضوع پر کوئی کتاب کیوں نہیں لکھی جا رہی ہے؟ فلاں ادارہ یہ کام کیوں نہیں کر رہا ہے؟ اگر ہم اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال کرتے تو وہ کام ہم خود کر لیتے اور موجود کو معدوم سمجھنے کے مرض میں مبتلا نہ ہوتے، کسی بھی چیز کو ''قوت'' سے ''فعل'' میں لانے کا طریقہ رونا دھونا یا گلے شکوے کرنا نہیں ہے، بلکہ سیدھا راستہ یہ ہے کہ عقل کی مدد سے متعلقہ اسباب ووسائل کو بروئے کار لایا جائے، اور اس طرح ''موجود غائب'' ''موجود حاضر'' بن جائے گا۔

مگر صد افسوس کہ ہماری اکثریت نے بے بسی، مظلومیت اور آہ وزاری کو اپنا مشغلہ بنا لیا ہے، اپنی نا اہلی سے ہم قیمتی صلاحیتیں ضائع کر رہے ہیں، بخت بیدار کو بخت خوابیدہ گردان رہے ہیں اور امت کو ان موجودات سے محروم کر رہے ہیں جو ہماری سعی پر منحصر ہیں۔

ذہنی طور پر درماندہ اور جسمانی لحاظ سے سست لوگوں کے گلہ آمیز مسلک کے خلاف اس کتاب کے مصنف کا طریقہ روشن جبیں ہے، جو نشاط وعمل کی راہ پر گامزن ہیں، اور بزبان حال گویا ہیں: ع

قدرت نے جو دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

مولانا محمد مسعود عزیزی صاحب جب ملت کے لئے کسی چیز کو ضروری سمجھتے ہیں تو بجائے شکایت کرنے کے اپنی صلاحیتوں اور محدود وسائل کو استعمال کر کے اسے وجود بخشنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں، وہ طلبہ وطالبات کے مدرسے چلا رہے ہیں، جدید تعلیمیافتہ طبقہ کی دینی تعلیم وتربیت کا محاذ سنبھالے ہوئے ہیں، ایک اسپتال بنوا رہے ہیں، ایک کالج بنوا رہے ہیں، ایک اردو ماہنامہ نکال رہے ہیں، اور وقتاً فوقتاً مختلف موضوعات پر بیش قیمتی تصنیفات سے علمی دنیا کو مالا مال کرتے رہتے ہیں، انہوں نے اصلاح، فقہ اور تربیت کی کتابوں کے علاوہ بہت سے بزرگوں کی سوانح بھی لکھی ہے، اور شاید کچھ بزرگ ایسے ہیں جن کی زندگی پر مولانا عزیزی صاحب کی تحریر کے علاوہ کوئی کتاب موجود نہیں، غرض عزیزی صاحب ہر کام کرتے ہیں، اور شروع سے آخر تک کرتے ہیں:

خود کوزہ وخود کوزہ گر وخود گل کوزہ، خود رند سبوکش۔

اسی طرح کی ایک سوانح یہ تازہ تصنیف ہے، کلکتہ اور لکھنؤ والوں پر استاد محترم مولانا محبوب الرحمٰن ازہری رحمہ اللہ کا قدیمی حق ہے، ان کے ہزاروں شاگرد دنیا کے مختلف حصوں میں منتشر ہیں، لوگ ان کی سوانح کا مطالبہ کر رہے ہیں، کچھ لوگ تراجم کے باب

میں ایک خلا کی شکایت کر رہے ہیں، مسعود عزیزی صاحب نے خاموشی سے مواد اکٹھا کیا، ترتیب وانتقاء کی محنت شاقہ برداشت کی، اور مولانا ازہری پر ایک مختصر مگر جامع اور ٹھوس کتاب تصنیف کر دی۔

مولانا محبوب الرحمٰن ازہری رحمہ اللہ علیہ ندوہ کے مایہ ناز اساتذہ ومربین میں تھے، ان کی تدریسی زندگی ستر سال کے طویل عرصہ پر محیط ہے، عربی ادب، تجوید وقرات اور حدیث شریف میں ان کو امتیاز حاصل تھا، وہ جتنے بلند پایہ مدرس اور داعی تھے اتنے ہی شریف النفس، ملنسار، پرہیزگار اور بااخلاق انسان تھے، طلبہ اور اساتذہ میں محبوب تھے، ادب کے ساتھ مولانا کی زندگی کے یہ متنوع پہلو اس کا ثبوت ہیں کہ مولانا ادب کو زندگی سے اور زندگی کو اسلامی وانسانی اقدار سے مربوط سمجھتے تھے، مولانا جن قدروں کے حامل تھے ان میں استقلال تھا، وہ ہوا کے جھونکوں سے زیروزبر نہ ہوتیں، اسی لئے طویل عرصہ کی رفاقت کے باوجود ان کے معاصرین ان کے کردار واوصاف کی ثناخوانی میں یکساں طور پر رطب اللسان نظر آتے ہیں۔

مجھے مولانا کی باقاعدہ شاگردی کا شرف نہ حاصل ہوسکا، تاہم دارالعلوم میں ان کی مجلسوں سے مستفید ہونے کا موقع ملا، ان سے ان کے دعوتی اور تبلیغی اسفار کی دلچسپ تفصیلات سنیں، جن میں سے کچھ آج بھی ذہن میں محفوظ ہیں، وہ مجاہدوں اور طربناک والمناک حوادث وتجربات کا خزانہ ہیں۔

ایک بار دولت کدہ پر حاضر ہوکر میں نے مولانا سے اجازت حدیث لی، اور غایت کرم سے انہوں نے قرآن کریم، اور حدیث شریف کی تمام سندوں کی اجازت مرحمت کی، مولانا سب سے اونچی سند محدث الحرمین الشریفین شیخ عمر حمدان المحرسی (۱۲۹۱-۱۳۶۸ہجری) کے واسطہ سے ہے، شیخ عمر کے تین اور معاصر محدثین تھے جو مختلف حیثیتوں سے ان کے ہم رتبہ ومماثل تھے، ان میں سب سے قدیم الوفاۃ علامہ ابوالخیر مکی

(مقیم ہندوستان) تھے، ان کے بعد ابن خلکان زمانہ علامہ عبدالحیٔ حسنی تھے، اور چوتھے درجہ میں حافظ عصر شیخ محمد عبدالحیٔ کتانی تھے، رحمہم اللہ اجمعین، ان چاروں نے کثرت رحلات واسفار کے ذریعہ اور مسندین کو تلاش کر کے حدیث کے قدیم ماہرین کی سنت کو زندہ کیا، اور ایک بار پھر ہر طرف مسلسلات، اوائل، اربعونات، اجزاء، سماعات اور اجازات کا بازار گرم ہو گیا۔

محدث الحرمین کے مستجیزین میں سب سے بڑی شخصیت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی تھی، ان کے بعد مولانا ازہری برصغیر کے دوسرے عالم ہیں جنہیں شیخ عمر حمدان سے اجازت حاصل ہوئی، ان دونوں کے علاوہ ہندوستان کا کوئی دوسرا عالم بمشکل ہوگا جسے شیخ عمر حمدان سے اجازت ہو، مولانا ازہری نے ان سے مکہ مکرمہ میں اپنی طالبعلمی کے دوران اجازت لی، عمر حمدان کے شیوخ کی تعداد بہت زیادہ ہے، ان میں نمایاں ترین ہیں: فالح بن محمد الظاہری، احمد بن اسماعیل البرزنجی، علی بن ظاہر الوتری، سلیمان حسب اللہ المکی، عبدالرحمٰن علیش، محمد ابراہیم السقا، شیخ الاسلام ابو حاجب، الطیب الشاذلی النفیر، الطاہر عاشور، عبدالکبیر الکتانی، حسین الحبشی، وغیرہ۔

عزیزی صاحب نے کتاب دس ابواب میں تقسیم کی ہے، جن میں صاحب سوانح کی زندگی کے تمام اہم پہلوؤں کے احاطہ کی کوشش کی ہے: نشو نما، تعلیم وتربیت، درس وتدریس، دعوت واصلاح، معاصرین اور شاگردوں کے اعترافات، صفات وخصوصیات، تالیف وتصنیف، وفات وباقیات صالحات، مصنف نے مولانا ازہری کے متعلق بنیادی معلومات اور بلا واسطہ شہادتیں محنت سے جمع کی ہیں، وہ اقوال واعترافات دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں، اوران سے کتاب کے اعتبار میں اضافہ ہوا ہے، ان شہادتوں میں سے چند پیش ہیں:

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی دامت براتہم: ''وہ دینی علوم اور زبان وادب میں امتیاز

رکھتے تھے،عربی زبان کی تدریس کا ان کو اچھا ملکہ تھا،اوراس سلسلے میں مہارت حاصل تھی، آپ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں حدیث شریف جیسی عظیم کتابوں کا بھی درس دیا،اور کچھ وقت صحیح بخاری اور مسلم شریف جیسی عظیم کتابوں کا بھی درس ان کے ذمہ رہا،انہوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کو اپنے علمی تعاون اور گراں قدر مشوروں سے تقویت پہنچانے کا سامان فراہم کیا۔(ص28-27)

مولانا سعید الرحمٰن اعظمی مدظلہ العالی:''میں نے مولانا محبوب الرحمٰن ازہری کی زبان سے عرب لہجہ اوراسلوب میں تقریر سنی تو اس کا مجھ پر ایک عجیب اثر ہوا۔(ص28)

مولانا سید محمد واضح رشید ندوی علیہ الرحمہ:''مولانا ایک مثالی استاد،مثالی داعی،مربی اورمثالی انسان تھے(ص31-30)ان کا عربی لہجہ اورطلبہ سے مخاطب ہونے کا انداز خود عربی زبان سے محبت اوراس میں کمال پیدا کرنے کا شوق پیدا کردیتا تھا۔(ص40)

مولانا کی ایک اہم خصوصیت دعوت واصلاح اور باطل فرقوں کا مقابلہ ہے،مولانا عزیزی لکھتے ہیں:''جنہوں نے دورحاضر کے فتنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا،کبھی بریلویت، اورکبھی قادیانیت،اورکبھی دیگر فتنوں سے برسرپیکاررہے،اوراسلام کی سربلندی کے لئے حتی المقدور تاحیات کوشاں رہے۔(ص13)

مفتی ظہوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ:''مولانا کا قیام کلکتہ میں صرف نوکری پیشہ کا قیام نہیں تھا، بلکہ وہ ایک دردمند داعی کی حیثیت سے رہے،ردقادیانیت کا گہرائی سے مطالعہ کیا،اورعملا اس فتنہ کے سدباب کے لئے تیار ہوگئے،اورکلکتہ کے آس پاس کے حلقوں میں خوب دورہ کیا،اورقادیانیت کی مخفی خباثت کو ایسا اجاگر کیا کہ عوام کو قادیانیت سے گھن آنے لگی،اور قادیانیت کے داعی ان حلقوں میں جانے سے شرمانے لگے، بالآخر وہاں سے اپنا بوریہ بستر اٹھا کر بھاگ نکلے۔(ص49)

عزیزی صاحب کی یہ تخلیق ان کے سلیقہ ترجمہ نگاری کی عمدہ مثال ہے، کتاب حشو و زوائد سے پاک ہے، اور قابل وثوق معلومات پر مشتمل، انداز تحریر متوازن ہے، حسن معنی و جمال ادا کے تناسب کا عکاس، اور اسلوب رواں دواں ہے، یہ کتاب لکھ کر مولانا عزیزی صاحب نے سیرت وسوانح کے باب میں ایک گرانقدر اضافہ کیا ہے، اور مولانا ازہری کے شاگردوں اور محبین پر احسان عظیم، کتنے قیمتی ہیں وہ نفوس جو جد وجہد کر کے اور قربانیاں دے کر امت کا فرض ادا کر رہے ہیں، اور علم وفن کا قرض اتار رہے ہیں۔

امید ہے کہ قارئین کرام اس کاوش کی قدر کریں گے، اسے بنظر استحسان دیکھیں گے، اور اس سے مستفید ہوں گے، اللہ تعالی مولانا ازہری کے درجات بلند کرے، اور مولانا عزیزی کو دونوں جہانوں میں بہترین بدلہ عطا فرمائے، آمین۔

والسلام
محمد اکرم ندوی، آکسفورڈ

۷ر رجب المرجب ۱۴۴۲ھ
مطابق ۱۹ر فروری ۲۰۲۱ء

تقریظ

ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی

خالِ معظم مولانا محبوب الرحمٰن ازہری کا آبائی وطن مغربی یوپی کا وہ مردم خیز خطہ تھا جس کی خاک سے علم وفضل، ورع وزہد اور تقوی کی ہمالیہ قامت شخصیات نمودار ہوئیں، جنہوں نے اپنے اخلاص وللّٰہیت، جہد وعمل، ایثار وقربانی اور فضل وکمال سے ایک عالم کو معطر کیا اور ان کے انفاس قدسیہ کی مشک ریزی سے قلب وروح آج تک سرشاری محسوس کرتے ہیں، چنانچہ آج بھی کیرانہ، بڈھانہ، تھانہ بھون، کاندھلہ، نانوتہ اور گنگوہ کی خاک میں ہماری جگمگاتی تاریخ کے کیسے کیسے مہر وماہ روپوش ہیں، مرحومی ماموں جان بھی کیرانہ کے معدن علم وفضل کے ایک درآبدار تھے، ان کے عظیم المرتبت والد (راقم کے نانا مرحوم) مولانا حافظ فضل الرحمٰن ندوی کیرانوی علامہ شبلی کے معتمد خاص اور علامہ سید سلیمان ندوی کے ہمدرس اور صدیق حمیم تھے، وہ انابت الی اللہ، ورع وتقوی اور پاکیزہ نفسی میں بلاشبہ ایک ولی صفت شخصیت تھے، حضرت ماموں جان نے محاسن سیرت وکردار کی روشنی اپنے عظیم القدر والد مرحوم سے جذب کی تھی۔

اگر ماموں جان علیہ الرحمہ کی شخصیت کا فنی تجزیہ کیا جائے تو جرأت مندی، حق گوئی، باضمیری، ایثار پیشی، اتباع سنت اور دینی شعائر کا احترام، طبیعت کی خودداری، بے لوثی وبے غرضی، گہری شرافت، انسانی بلندی، آسودۂ تمنا اور محدود طلب اور عزت نفس اس کے چند روشن عنوانات ہوں گے، بلاشبہ وہ عشق نبوی سے سرشار اور توحید خالص کے پرستار تھے، ان کے اندر دین شفاف کی حمایت حمیت کے درجہ تک پہنچی ہوئی تھی، واقعہ یہ ہے کہ دینی تحمس ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، مذہبی اور معاشرتی امور میں اعتدال پسندی

کے باوجود کوئی بات خلاف شرع برداشت نہ کرتے تھے۔

اور اسی باعث وہ رہتی زندگی فرق باطلہ کا تعاقب کرتے اور ان کے گمراہ کن عقائد کا مسکت جواب دیتے رہے، بلاشبہ قادیانیت کے موضوع پر ان کا مطالعہ بیحد وسیع تھا، ہم عصر ہندوستانی علماء میں اس کی نظیر خال خال ہی مل سکتی ہے، چنانچہ مرحوم نے رہتی زندگی پورے انشراح کے ساتھ قادنیوں کا تعاقب کیا، گزشتہ صدی کی چھٹی دہائی میں ہزاروں قادیانیوں کی سفر حج پر روانگی رکوادینے کی جرأت اندیشانہ جدوجہد ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے، اور اس کٹھن راہ کی آزمائشوں میں وہ استقامت کا پہاڑ بنے رہے، اس خصوص میں مرحوم کی تالیف ''سفر قادیان'' ان کی جانکاہ جدوجہد کی بڑی بصیرت افروز تصویر پیش کرتی ہے۔

ماموں جان مرحوم کا سراپا بھی بہت پرکشش تھا، میانہ قد، خوب گورا چٹا رنگ، کشادہ پیشانی پر فکر وتدبر کی سلوٹیں اس امر کا پتہ دیتی تھیں کہ قلب ودماغ کے سمندر میں ذہنی روئیں چل رہی ہیں، رفتار میں لپک، گفتار میں مہک، مسکراتی ہوئی آنکھیں جن سے معصومیت اور حیا ٹپکتی تھی، جب وہ گردش کرتیں تو دانائی کروٹیں لیتی محسوس ہوتی تھی، چہرہ خوبصورت ڈاڑھی سے مزین، بشرے پر ہمیشہ امید کی شفق اور تبسم کی افشاں بکھری رہتی تھی، جسم میں ایسی پھرتی جیسے بجلیاں کوندرہی ہوں، اس دلکش سراپا کے ساتھ جب وہ چلتے تو لگتا حسن وجمال اور فضل وکمال کا مجسمہ جنبش میں ہو۔

حضرت ماموں جان مرحوم متنوع کمالات اور قابلیتوں کا پیکر متحرک تھے، وہ بچپن ہی میں حفظ قرآن کی دولت سے بہرہ ور ہوئے، ان کو قرآن پوری زندگی بہت اچھا یاد رہا، مرحوم نے بلاتخلف کامل ستر سال تک رمضان میں محراب سنائی، علم تجوید وقرأت میں ان کو استاد وقت قاری عبدالمالک مرحوم سے تلمذ خاص کا شرف حاصل تھا، پھر حضرت نانا مرحوم نے ہندوستان میں ابتدائی دینی تعلیم دلانے کے بعد ان کو مزید تربیت کے لئے مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ بھیج دیا، جہاں انہوں نے کئی سال قیام کر کے علوم درسیہ میں فراغت

حاصل کی، اس کے بعد وہ مزید تکمیل وتخصص کی غرض سے جامعہ ازہر مصر چلے گئے، اور وہاں کلیۃ اصول الدین سے جون ۱۹۴۲ء میں فارغ ہوکر ہندوستان واپس آئے اور فروری ۱۹۴۳ء میں ندوہ میں عربی زبان وادب کے استاذ مقرر ہوئے، یہاں کامل ۶/سال تدریسی خدمت انجام دینے کے بعد وہ حکومت مغربی بنگال کے عربی کالج'' کلکتہ مدرسہ'' (حال مدرسہ عالیہ یونیورسٹی) میں عربی زبان وادب کے پروفیسر ہوکر چلے گئے، اور وہاں سے ۱۹۷۷ء میں وظیفہ پر سبکدوش ہونے کے بعد تادم واپسیں ندوہ کے لئے وقف ہوکر رہ گئے۔

مرحومی ماموں جان کی شخصیت بڑی کثیر الجہات اور جامع الصفات تھی، ان کو عربی زبان وادب پر غیر معمولی عبور اور اس کے رموز ونکات پر ید طولی حاصل تھا، وہ عربی بالکل مادری زبان کی طرح بولتے اور لکھتے تھے، بلکہ وہ ایسی فصیح وبلیغ عربی لکھتے تھے کہ اہل زبان بھی عش عش کر اٹھتے، انہوں نے ندوہ میں غیر ملکی طلبہ کی تدریس کے فرائض انجام دئے، اس لئے ملک اور بیرون ملک میں ان کی معنوی اولاد حد شمار سے باہر ہے، تدریس کے علاوہ کافی عرصہ وہ تمام رواقوں کے چیف نگراں بھی مامور رہے، ماموں جان اردو اور عربی دونوں زبانوں میں یکساں قدرت کے ساتھ خطابت کے جوہر دکھاتے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ ماموں جان عاجز راقم سطور کو اپنی حقیقی اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے، جس پر میرے نام ان کے بلا مبالغہ سینکڑوں خطوط شاہد عدل ہیں (کاش وہ محفوظ رہ گئے ہوتے) ان کی خصوصی تربیت وسرپرستی بلاشبہ میرا قیمتی سرمایہ حیات ہے، ہوش وتعقل کی کلیاں کھلنے کے بعد سے لیکر مرحوم کے دم واپسیں تقریباً ستر سال کی مدت تک راقم رگ جان کی طرح ان سے قریب تر رہا، اور ان کی خلوت وجلوت کی زندگی کے ایک ایک عکس ونقش کا شاہد عیاں بنا، لاریب عاجز اپنے ماموں کے گونا گوں احسانات، متنوع کرم فرمائیوں اور بے پایاں شفقتوں سے گرانبار ہے، وہ ہر پہلو سے ایک آئیڈیل شخصیت تھے۔

حضرت ماموں جان نے مجموعی طور پر تقریباً نصف صدی تک ندوہ میں پورے اخلاص،

محنت اور ایثار پیشگی کے ساتھ تدریسی خدمات انجام دیں، مگر بایں ہمہ افسوس ہے کہ ان کو شہرت ومقبولیت کا وہ مقام حاصل نہ ہوسکا جس کے وہ قرار واقعی مستحق تھے، اس میں زیادہ دخل تو ان کی خود اختیاری عزلت پسندی، فرط تواضع اور نمود ذات سے نفور کا رہا، ورنہ اس سے کم مدت تک ندوہ کے بہت سے کارگزاروں کو اپنی عالی نسبی کے باعث شہرت ومقبولیت کا ریکارڈ عروج حاصل ہوا، بلا شبہ ماموں جان جیسی باکمال وجامع الصفات اور ندوہ کی جانثار شخصیت بجا طور پر مستحق تھی کہ ان کے سوانح وکمالات پر عربی واردو میں گراں پلہ کتابیں تالیف کی جاتیں، چند سال قبل کچھ قدر دانوں نے ماموں جان کی شخصیت وخدمات پر لکھنؤ میں ایک سیمینار کا انعقاد کیا تھا، جس میں پڑھے گئے مقالات کو بعد میں کتابی شکل میں شائع کیا گیا، یہ نقش اولین یقیناً لائق تحسین ہے، مگر ہنوز موضوع پر تشنگی کا احساس باقی رہتا تھا۔

مقام صد شکر ہے کہ ہمارے فاضل دوست اور بلند پایہ ادیب مولانا مفتی محمد مسعود عزیزی ندوی سلمہ اللہ تعالی نے وقت کی اس اہم ضرورت کا ادراک کرکے ماموں جان کی شخصیت وکردار اور فن وفکر پر دس ابواب پر مشتمل ایک اچھی بھلی کتاب تالیف کرڈالی، راقم کو اس کتاب کی پی ڈی ایف فائل کا مطالعہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، جس سے موصوف عزیز کی بلند ہمتی، عالی حوصلگی، تلاش وجستجو اور جانکاہ محنت ودیدہ ریزی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، مولانا عزیزی بلا شبہ ایک پختہ کار اور صاحب طرز نثر نگار ہیں، اعتدال وتوازن، سلاست وشستگی، اور شگفتہ بیانی ان کی نگارشات کے نمایاں ترین جوہر ہیں، وہ تحریر وتالیف کے علاوہ مختلف میدانوں میں دین وملت کی جو بیش بہا خدمات انجام دے رہے ہیں، وہ لائق صد تبریک ہیں، اللہم زد فزد۔

عاجز راقم سطور کو حق الیقین ہے کہ مولانا موصوف کی دیگر قلمی کاوشوں کی طرح یہ کتاب بھی ان شاء اللہ قبول عام حاصل کرے گی۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز

نعیم صدیقی ندوی

حال مقیم جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ

۲۴؍فروری ۲۰۲۱ء

عرض مؤلف

الحمد لله رب العالمين و الصلاة و السلام على سيد المرسلين محمد و آله و صحبه اجمعين:

امابعد! بزرگان دین اوراکابرین امت کے حالات میں اللہ تعالی نے بہت تاثیر رکھی ہے،جن کے مطالعہ سے زندگی میں کچھ کرگزرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اورانسان اپنے بڑوں کی سی زندگی گزارنیکی کوشش کرتا ہے،اور یہ اللہ تعالی نے دنیا میں ایک دستور بھی بنایا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے سیکھتا ہے اور ہر جونیر اپنے سینیر کے کردار اور حالات زندگی سے سبق حاصل کرتا ہے،اوراس کے طریق وراستہ پر چل کر اپنی زندگی کو اس کے اعمال وکردار کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے،اس لئے ہر دور میں اہل علم، ادباء اور ممتاز شخصیات کے حالات قلم بند کرنے کا رواج رہا ہے، اور اس سلسلہ میں پورا ایک کتب خانہ موجود ہے۔

راقم سطور کو بزرگان دین اوراکابر کی سیرت وسوانح پر لکھنے کا ذوق اور دلچسپی ہے، اوراس موضوع سے خاص مناسبت ہے،اس لئے بیس سے زیادہ شخصیات پر مستقل کتابیں لکھی ہیں،اور پچاس سے زیادہ شخصیات پر خاکے تحریر کر چکا ہے،اوراب راقم نے ندوہ اور مدرسہ عالیہ کلکتہ کی ایک ممتاز شخصیت حضرت مولانا محبوب الرحمٰن صاحب ازہری کی سوانح حیات پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا،اوراس کی تقریب یہ ہوئی کہ راقم نے اکتوبر ۲۰۱۷ء میں کناڈا کا سفر کیا، میز بانی کے جملہ فرائض گرامی قدر جناب حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن صاحب فیضی ندوی نے انجام دئے،اس وقت اس موضوع پر گفتگو ہوئی کہ حضرت مولانا محبوب الرحمٰن صاحب کے حالات پر کوئی کتاب آنی چاہئے، میں نے اس تذکرہ کو

اور اس امر کو اپنے لئے سعادت کی بات سمجھا اور کتاب لکھنے کا ارادہ کرلیا، چنانچہ سفر سے واپسی پر یہ کتاب ''حیات ازہری'' تیار کی۔

اس کی تیاری میں سب سے زیادہ تعاون مولانا سید محمد عبدالرشید صاحب ندوی نے کیا، اور مواد کے فراہم کرنے میں مدد کی، بلکہ سب سے زیادہ ان کی کتاب ''مولانا محبوب الرحمٰن ازہری حیات وخدمات'' جو مختلف اہل علم و اہل قلم حضرات کے مضامین کا مجموعہ ہے، اس کتاب کی تیاری میں ممد ومعاون ثابت ہوئی، اور بانگ حرا کا خاص نمبر بابت جنوری، فروری ۲۰۱۱ء جو حضرت مولانا محبوب الرحمٰن ازہری کی حیات پر ہے، وہ بھی اس کتاب کا مآخذ ہے، اس سے بھی استفادہ کیا گیا، راقم نے اس کتاب میں دوسروں کی تحریروں سے زیادہ مدد لی ہے اور کوشش کی ہے کہ نقل کرتے وقت صاحب اقتباس کا نام تحریر کردیا جائے، لیکن اگر کہیں نام نہ لکھ سکا تو پیشگی معافی اور معذرت خواہ ہوں، کتاب پر سب سے پہلے ڈاکٹر اکرم صاحب ندوی نے پیش لفظ تحریر کیا ہے، اس کے بعد ڈاکٹر نعیم صدیقی نے تقریظ تحریر کی ہے، دونوں بزرگوں نے مصنف کی حوصلہ افزائی اور قدردانی کی، اللہ تعالیٰ دونوں کو اجر عظیم عطا فرمائے اور دونوں کا سایہ تادیر قائم و دائم رہے، اسی طرح صاحب سوانح کے بڑے صاحب زادے ڈاکٹر سعید الرحمٰن صاحب فیضی ندوی جن کے ایماء سے یہ کتاب معرض وجود میں آئی، انہوں نے اپنی قیمتی تحریر مقدمہ کی شکل میں لکھی، اللہ تعالیٰ ان کو بھی اجر عظیم عطا فرمائے اور ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے اللہ تعالیٰ اس ناچیز اور حقیر کوشش کو قبول عام عطا فرمائے، اور صاحب سوانح کے درجات بلند فرمائے۔

والسلام

محمد مسعود عزیزی ندوی
رئیس مرکز احیاء الفکر الاسلامی
مظفرآباد سہارنپور یوپی

۵/صفر ۱۴۴۳ھ
۱۳/ستمبر ۲۰۲۱ء بروز پیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف صاحب کتاب

تمہید

مولانا قاری مفتی محمد مسعود عزیزی ندوی بن حافظ عبدالستار بن منشی عبدالعزیزؒ بروز جمعہ ۱۲؍ ربیع الاول ۱۳۹۴ھ م ۵؍اپریل ۱۹۷۴ء مظفری قصبہ مظفرآباد ضلع سہارنپور (یوپی) میں پیدا ہوئے، عزیزی کی نسبت اپنے دادا حضرت منشی عبدالعزیزؒ کی طرف کرتے ہیں، جوایک عبادت گذار، نیک وپرہیزگار آدمی تھے، جن کا دل ہر وقت مسجد میں لگا رہتا تھا اور علماء ربانیین اور صلحاء متقین سے گہرا تعلق تھا، مولانا کے والد صاحب حضرت حافظ عبدالستار صاحب عزیزی کی پیدائش یکم اپریل ۱۹۳۲ء کو ہوئی، انہوں نے حفظ قرآن کے بعد عصری تعلیم حاصل کی، اسکول اور دینی مدرسہ میں درس وتدریس کے بعد پوسٹ آفس میں ایک عرصے تک ملازمت کی، ریٹائرڈ ہونے کے بعد مرکز احیاء الفکرالاسلامی مظفرآباد میں اپنی دینی خدمات وفات تک پیش کیں، بیعت وسلوک کا تعلق حضرت مولانا سید مکرم حسین صاحب سنسارپوری سے رکھا، جو آپ کے استاذ بھی تھے، ۱۷؍جولائی ۲۰۱۶ء میں وفات پائی، حضرت مولانا سید مکرم حسین صاحب سنسارپوری نے نماز جنازہ پڑھائی، جبکہ اکتالیس سال قبل آپ کے والد منشی عبدالعزیز صاحب کی نماز جنازہ بھی حضرت موصوف نے ہی اکتوبر ۱۹۷۵ء میں پڑھائی تھی، مفتی صاحب کی والدہ محترمہ کی وفات ۲۰؍فروری ۲۰۱۲ء میں ہوگئی تھی، اللہ تعالیٰ سب کی مغفرت فرما کر درجات بلند فرمائے۔

ابتدائی تعلیم

ابتدائی تعلیم محلّہ کی مسجد میں حافظ محمد اخلاق صاحبؒ سے حاصل کی اور یہیں قرآن مجید

کے آخری دو پارے حفظ کئے، نو سال کی عمر میں ۱۲؍شوال ۱۴۰۳ھ مطابق ۲۳؍جولائی ۱۹۸۳ء سنیچر کے روز جامعہ بیت العلوم پیپلی مزرعہ، یمنا نگر (ہریانہ) میں داخل کئے گئے اور وہاں نو سال رہ کر قرآن کریم بروایت حفص تجوید وترتیل کے ساتھ حفظ کیا، اور سند حاصل کی، وہاں اردو، ہندی، انگریزی پڑھی، فارسی اور عربی نحو وصرف کی چند کتابیں بھی پڑھیں، نیز جامعہ اردو علی گڈھ کے امتحانات میں بھی شریک ہوئے اور ''ادیب'' ''ادیب ماہر'' کے امتحانات دیئے اور فرسٹ ڈویژن سے پاس ہوئے، اور کمپیوٹر سیکھا، وہیں کے دوران قیام اردو میں ''مختصر تجوید القرآن'' نامی ایک کتاب تصنیف کی، جس پر اس فن کے علماء نے تقاریظ لکھیں اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے مقدمہ اور حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندویؒ نے اپنی رائے لکھی، اس کتاب نے علمی حلقوں میں قبولیت حاصل کی، کراچی سے بھی اس کی اشاعت ہوئی، یہاں تک کہ بہت سے مدارس اسلامیہ میں داخل نصاب کی گئی، اور کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔

اس کے بعد ۱۴؍شوال ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۵؍اپریل ۱۹۹۲ء میں ''مدرسہ فیض ہدایت رحیمی'' رائے پور میں داخلہ لیا اور یہاں دو سال گزارے اور درس نظامی کے مطابق کافیہ وشرح جامی تک تعلیم حاصل کی، رائے پور کے قیام کے دوران حضرت حافظ عبدالرشید صاحب رائے پوریؒ (ت:۱۹۹۶ھ) کی صحبت اختیار کی، جو عارف باللہ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ (ت:۱۹۶۲ء) کے خادم خاص اور خلیفہ تھے، ان کے دست مبارک پر بیعت کی، انکی مجلسوں میں شریک رہے، ان کی صحبت سے فیض اٹھایا، سفر وحضر میں ان کے ساتھ رہے، ان سے دینی وروحانی تربیت حاصل کی، اور پنجوقتہ نمازوں میں ان کی امامت کرنے کا بھی شرف حاصل کیا، ان کی وفات کے بعد ان کے حالات وسوانح پر ''حیات عبدالرشید'' کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی، جس نے کافی مقبولیت حاصل کی، اور اس کے چار ایڈیشن شائع ہوگئے۔

اعلیٰ تعلیم

اس کے بعد ۱۷ر شوال ۱۴۱۴ھ مطابق ۳۰ر مارچ ۱۹۹۴ء میں ''مدرسہ ضیاء العلوم'' میدان پور رائے بریلی میں داخل ہوئے اور وہاں عالیہ اولیٰ تک تعلیم حاصل کی، وہاں کے ماہر اساتذۂ کرام سے استفادہ کیا اور مدرسہ کے علمی دعوتی وفکری ماحول اور آب وہوا سے متأثر ہوئے حتی کہ علم ومطالعہ اور تحریر ونگارش میں اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کیا، اور آخری سال میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کے سالانہ امتحان میں شریک ہوئے، امتحان میں کامیابی کے بعد ۱۳ر شوال ۱۴۱۵ھ مطابق ۱۵ر مارچ ۱۹۹۵ء کو دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے اور وہاں تین سال میں ۱۴۱۸ھ مطابق ۱۹۹۷ء کو شرعی علوم اور عربی زبان وادب میں عالمیت کی سند حاصل کی۔

فقہ وفتاوی میں اختصاص

اگلے سال ماہ شوال ۱۴۱۸ھ میں درجہ فضیلت میں داخل ہوئے اور دو سال میں فقہ وافتاء میں تخصص کیا اور سند حاصل کی، شعبان ۱۴۲۰ھ مطابق دسمبر ۱۹۹۹ء میں ندوہ سے فراغت حاصل کی، ندوۃ العلماء میں قیام کے دوران دو سالوں (۱۹۹۶ء/ ۱۹۹۷ء) میں مولانا قاری ریاض احمد مظاہری صدر شعبۂ تجوید وقراءت سبعہ وعشرہ دار العلوم ندوۃ العلماء سے قراءت سبعہ کی تکمیل کی۔

ندوہ کے خاص اساتذہ

مندرجہ ذیل اساتذۂ کرام سے بطور خاص استفادہ کیا: مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، صحافی وادیب حضرت مولانا واضح رشید حسنی ندویؒ، امام وخطیب حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، مفتیٔ اعظم ندوہ حضرت مولانا مفتی محمد ظہور

صاحب ندویؒ، ادیب دوراں حضرت مولانا نذر الحفیظ صاحب ندوی ازہری، محدث جلیل حضرت مولانا ناصر علی صاحب ندویؒ، مفسر قرآن حضرت مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی، فقیہ زماں حضرت مولانا عتیق احمد صاحب بستوی، داعی الی اللہ حضرت مولانا سید عبداللہ محمد حسنی ندویؒ، حضرت مولانا یعقوب صاحب ندوی، حضرت مولانا محمد زکریا صاحب سنبھلی ندوی، حضرت مولانا نیاز احمد صاحب ندوی ، حضرت مولانا رشید احمد صاحب ندوی، حضرت مولانا مفتی محمد مستقیم صاحب ندوی اور حضرت مولانا برجیس صاحب ندویؒ وغیرہم۔

حضرت مفکر اسلام سے خاص تعلق

مولانا نے ندوۃ العلماء میں قیام کے دوران حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے بیعت کی اور ان کی علمی مجلسوں اور صحبتوں سے فیضاب ہوئے، یہاں تک کہ حضرت کے قریب ہوگئے اور اخیر دور میں حضرت کی خدمت اور تین وقتوں کی نماز کی امامت کی بھی سعادت حاصل کی اور حضرت کی صحبت بابرکت سے خصوصی فیض اٹھایا اور مولانا کی آٹھ کتابوں پر حضرت نے مقدمے تحریر فرمائے، نیز نکاح بھی حضرت مولانا نے پڑھایا اور خود حضرت نے ہی ولیمہ بھی کیا۔

بیعت وسلوک وطریقت

آپ سب سے پہلے ۱۵ر شعبان ۱۴۱۳ھ مطابق ۸ر فروری ۱۹۹۳ء پیر کے روز تہجد کے وقت حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری کے خلیفہ حضرت الحاج شاہ عبدالرشید صاحب رائے پوری سے بیعت ہوئے، اور ان کی خدمت وصحبت سے فیض اٹھایا، ۷ر رمضان ۱۴۱۶ھ م ۲۷ر جنوری ۱۹۹۶ء میں ان کی وفات کے بعد مفکر اسلام حضرت

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نوراللہ مرقدہ سے ۲۴؍شوال ۱۴۱۶ھ مطابق ۱۵؍مارچ ۱۹۹۶ء کو رجوع کیا اور بیعت ہوئے، اوران کی مجالس اور صحبت بابرکت سے فیضیاب ہوئے، ۲۲؍رمضان ۱۴۲۰ھ مطابق ۳۱؍دسمبر ۱۹۹۹ء بروز جمعہ حضرت مفکر اسلام کا وصال ہوگیا، اس کے بعد انکے جانشین مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے تجدید بیعت کی، اب ان کی سرپرستی میں تعلیمی، سماجی، رفاہی، تبلیغی اور اصلاحی دعوتی سرگرمیاں جاری رکھ کر خدمت دین کا کام انجام دے رہے ہیں۔

اجازت وخلافت

مئی ۲۰۱۴ء میں آپ نے قطر کا سفر کیا، وہاں آپ کی ملاقات مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نوراللہ مرقدہ کے مجاز بیعت اور حضرت مولانا قمرالزماں صاحب الہ آبادی کے خلیفہ حضرت مولانا ظریف احمد صاحب ندوی سے ہوئی، حضرت مولانا ظریف احمد صاحب نے مفتی صاحب موصوف کو سلاسل اربعہ اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے سلسلہ میں ۱۹؍رجب ۱۴۳۵ھ مطابق ۱۹؍مئی ۲۰۱۴ء پیر کے روز اجازت وخلافت عطا فرمائی اور جب حضرت مولانا ظریف احمد صاحب ندوی ۳؍ستمبر ۲۰۱۴ء کو مرکز احیاء الفکر الاسلامی مظفرآباد تشریف لائے تو مرکز کی جامع مسجد میں ایک مجمع کے سامنے موصوف کی اجازت وخلافت کا اعلان کیا، اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب قاسمی خلیفہ حضرت شاہ حافظ عبدالستار صاحب نانکویؒ وحضرت مولانا عبداللہ صاحب مغیثی سے ملاقات کے لئے چھٹمل پور جانا ہوا تو حضرت نے بھی مولانا موصوف کو ۲۹؍ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ مطابق ۱۹؍فروری ۲۰۱۵ء جمعرات کے روز اجازت وخلافت سے نوازا، ۲۶؍شعبان ۱۴۳۹ھ م ۱۳؍مئی ۲۰۱۸ء اتوار کے روز کو حضرت مولانا سید مکرم حسین صاحب سنسارپوری کی خدمت میں جانا ہوا، تو حضرت نے بھی مولانا موصوف کو اجازت وخلافت عطا فرمائی، اس

طرح موصوف کا علمی و روحانی اور اصلاحی فیض بھی جاری وساری ہے، مولانا موصوف دنیا کے مختلف ممالک میں سو سے زیادہ علماء کرام کو یہ روحانی فیض منتقل کر چکے ہیں اور ان کو اجازت وخلافت دے چکے ہیں، اللہ تعالیٰ سب کو دین کی خدمت کیلئے قبول فرمائے۔

تالیفات

عربی وار دو اور انگریزی زبانوں میں مختلف موضوعات پر چھوٹی بڑی تقریباً ۵۴ رکتابیں چھپ چکی ہیں:

عربی

(۱) ریاض البیان فی تجوید القرآن
(۲) مراجع الفقہ الحنفی ومیزاتہا
(۳) الإمامۃ فی الصلاۃ مسائلہا وأحکامہا
(۴) التدخین بین الشرع والطب
(۵) سیرۃ النبی الاکرم
(۶) القادیانیۃ ثورۃ علی النبوۃ المحمدیۃ

اردو

(۷) مختصر تجوید القرآن
(۸) بچوں کی تمرین التجوید
(۹) جیب کی تجوید
(۱۰) رہنمائے سلوک وطریقت
(۱۱) فقہ حنفی کے مراجع اور ان کی خصوصیات
(۱۲) امامت کے مسائل واحکام
(۱۳) حیات عبد الرشیدؒ
(۱۴) سیرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلویؒ

(۱۵) تذکرہ مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ
(۱۶) تذکرہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ
(۱۷) تذکرہ علامہ سید سلیمان ندویؒ
(۱۸) تذکرہ شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ
(۱۹) چند مایہ ناز اسلاف-قدیم وجدید (۴۲ر بزرگوں کے حالات کا مجموعہ)
(۲۰) مقالات ومشاہدات (۲۸ر مضامین کا مجموعہ)
(۲۱) مکتوبات اکابر (۲۰ر بزرگوں کے خطوط)
(۲۲) چندہ دینے، دلوانے اور لینے کے آداب واصول
(۲۳) افکار دل (۳۰ر خطبات کا مجموعہ)
(۲۴) مدارس اسلامیہ کا نظام-تحلیل وتجزیہ
(۲۵) تذکرہ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ
(۲۶) سیرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
(۲۷) تذکرہ حضرت حافظ عبدالرشید صاحب رائے پوریؒ
(۲۸) قادیانیت-نبوت محمدی کے خلاف بغاوت
(۲۹) میری والدہ مرحومہ
(۳۰) لڑکیوں کی اصلاح وتربیت
(۳۱) نقوش حیات حضرت مولانا عبدالرحیم متالاؒ
(۳۲) ملفوظات حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ
(۳۳) تصوف اور اکابر دیوبند
(۳۴) اللہ ورسول کی محبت
(۳۵) ماں باپ اور اولاد کے حقوق

(۳۶) عقائداورارکان اسلام
(۳۷) سازدل (۱۵ر تقریوں کا مجموعہ)
(۳۸) میرے شیخ ومرشد مفکراسلام
(۳۹) دردِدل (۴۵ر مضامین کا مجموعہ)
(۴۰) تذکرہ حضرت مفتی عبدالقیوم صاحب رائے پوری
(۴۱) بزرگان رائے پور (۷ر بزرگوں کے حالات)
(۴۲) گذرگاہیں (۱۴ر سفرناموں کا مجموعہ)
(۴۳) کامیابی کے اصول اوراللہ کے مقبول بندے
(۴۴) فقہ حنفی کے مراجع اوران کی خصوصیات
(۴۵) حیات شیخ الحدیث

انگلش

(۴۶) Rules of Raising Funds
(۴۷) Beliefs and Pillars of Islam
(۴۸) The Laws Pertaining to Imamat
(۴۹) The Rights of Perents and children
(۵۰) Guidelines for Sulook and Tareeqat
(۵۱) Tasawwuf and the Elders of Deoband
(۵۲) Life Sketch of Hadhrat Thanwi
(۵۳) A Biogrophy of the Noblest Nabi
(۵۴) My Sheikh and Spiritual Guide

اسفار

پہلی مرتبہ ۲۰۰۰ء میں پڑوسی ملک پاکستان کا سفر کیا اور وہاں بہت سے علماء، صلحاء اور

ادباء سے ملاقات کی اور مدارس ومکاتب کی زیارت کی، پھر ۲۰۰۱ء میں جنوبی افریقہ کا سفر کیا اور وہاں مسلمانوں کے حالات اوران کی دینی، اصلاحی، دعوتی سرگرمیاں دیکھیں اوراسلامی مکاتب ومدراس اوران کے تجارتی مراکز کا معاینہ کیا اور بہت سے اسلامی دانشوروں اور علماء کرام سے ملاقات کی۔

اس کے بعد جنوبی افریقہ کے پڑوسی ممالک جیسے ''بوٹسوانہ'' کا نومبر ۲۰۰۱ء میں سفر کیا، پھر رمضان ۱۴۲۱ھ مطابق دسمبر ۲۰۰۱ء میں شوازی لینڈ کا سفر کیا، اس کے بعد زمبابوے بھی جانا ہوا، اور ۲۰۰۲ء میں کویت کا سفر کیا اور وہاں شیخ نادر عبدالعزیز نوریؒ (جنرل سکریٹری جمعیۃ الشیخ عبداللہ النوری الخیریہ، ومدیر علاقات خارجیہ وزارۃ اوقاف کویت) اور شیخ عبداللہ العلی المطوعؒ (صدر جمعیۃ الاصلاح الاجتماعی، ومالک شرکۃ علی عبدالوہاب) اور فاضل استاذ شیخ یوسف جاسم الحجی (صدر انٹرنیشنل اسلامک چیرٹیبل آرگنائزیشن) سے ملاقات کی اور یہاں دس روز قیام رہا اور سرکاری مہمان رہے، اسی سال متحدہ عرب امارات دبئی کی بھی زیارت کی اور یہاں تین دن قیام کیا۔

ماہ رمضان ۱۴۲۴ھ مطابق ۲۰۰۳ء میں عمرہ کے لیے حجاز مقدس کا سفر کیا اور حرم مکی کے قریب ''مدرسہ صولتیہ'' میں قیام کیا، اس کے بعد مدینہ منورہ جاکر مسجد نبوی کی زیارت کی، اس میں نماز پڑھی اور ریاض الجنۃ میں بھی نوافل اور دعاء کا موقع ملا، اور مواجہ شریف پر حاضری ہوئی اور آقائے مدنی حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام پڑھا۔

۲۰۰۴ء میں ایک افریقی ملک ''ملاوی'' کی راجدھانی ''للونگوے'' کا سفر کیا، پھر ''زامبیا'' گئے اور وہاں ''چیپاٹا'' اور ''زامبیا'' کی راجدھانی ''لوساکا'' گئے، اور وہاں علماء اور صلحاء، دعاۃ سے ملاقات کی، جو وہاں سیاہ فام لوگوں اور نئی نسل کی اسلامی تعلیم وتربیت کی خدمت انجام دے رہے ہیں، وہاں کے اکثر لوگ جودوسخاوت اور اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا اور دینی ودعوتی خدمت کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں، ایک جم غفیر کی موجودگی

میں راجدھانی کی مسجد ''النور'' میں بیان کیا، اوران کے سامنے کتاب وسنت کی روشنی میں دعوت الی اللہ کے اصول وضوابط اور فضائل واحکام پیش کئے اور مسلمانوں اور غیر مسلموں میں ان کی دعوتی اوراصلاحی خدمات اورسرگرمیوں کوسراہا، تقریباً ایک ماہ یہاں قیام رہا، ماہ ذی الحجہ ۱۴۲۵ھ مطابق ۲۰۰۵ء میں اپنے والدین کے ساتھ مناسک حج بیت اللہ اورعمرہ کی ادائیگی کے لیے حجاز مقدس کا سفر کیا، اس کے بعد جنوبی افریقہ اورزامبیا متعدد مرتبہ جانا ہوا، کئی مرتبہ موزمبیق بھی جانا ہوا، اور ۲۰۱۱ء میں ملیشیا اورسنگاپور کا بھی سفر ہوا، مئی ۲۰۱۴ء میں آپ نے قطر کا سفر کیا، اور ایک ہفتہ وہاں قیام رہا، اس کے درمیان حج اورعمرہ کے اسفار بھی ہوئے، اور مارچ ۲۰۱۷ء میں ری یونین اور ماریشس کا بھی سفر ہوا اور دو ہفتے وہاں قیام رہا، ستمبر ۲۰۱۷ء کے آخیر میں یوکے (برطانیہ) کا سفر کیا، وہاں ایک ماہ قیام رہا، اور اکتوبر کے اخیر میں کناڈا کا سفر کیا اور وہاں بھی بیس روز قیام رہا، جنوری ۲۰۱۸ء کے دوسرے عشرے میں بنگلہ دیش کا چار دن کا دعوتی سفر ہوا۔

سابقہ مشغولیات

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فراغت کے بعد ۲۰۰۰ء میں ''جامعہ بیت العلوم'' پہلی مزرعہ، یمنانگر (ہریانہ) میں مدرس اور مفتی کی حیثیت سے تقرر ہوا، اس کے بعد جامعہ میں ناظم تعلیمات کے منصب پر فائز ہوئے اور وہاں صرف ایک سال قیام فرما کر سبکدوشی حاصل کی۔

مرکز احیاء الفکر الاسلامی کا قیام

اس کے بعد حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی سرپرستی میں ۲۰/رجب ۱۴۲۱ھ مطابق ۱۹/اکتوبر ۲۰۰۰ء کو قصبہ مظفرآباد ضلع سہارنپور (یوپی) میں ''مرکز احیاء الفکر الاسلامی'' کے نام سے ایک دینی، دعوتی اور

علمی مرکز قائم کیا، جونسل نو کی اسلامی تعلیم وتربیت کی خدمت انجام دے رہا ہے، اس کی بنیاد صحیح اسلامی فکر پر رکھی گئی ہے، اس کا مقصد علوم اسلامیہ کی اشاعت وحفاظت اور سیرت نبوی اور قرآن وحدیث کے مطابق نئی نسل کی تعلیم وتربیت کا انتظام کرنا ہے۔

مرکز کے شعبہ جات

مرکز کی زیر نگرانی حسب ذیل شعبے کام کررہے ہیں:

(۱) جامعۃ الامام ابی الحسن الاسلامیہ
(۲) جامعہ فاطمۃ الزہراء للبنات
(۳) ڈپلومہ ان انگلش لنگویج اینڈ لٹریچر
(۴) ڈیسنٹ انڈین پبلک کالج
(۵) ڈی فارما کالج
(٦) مکتبۃ الامام أبی الحسن العامۃ
(۷) دار البحوث والنشر
(۸) دار الافتاء
(۹) جمعیۃ اصلاح البیان
(۱۰) مجلس صحافت اسلامیہ
(۱۱) ماہنامہ نقوش اسلام
(۱۲) شعبۂ دعوت وارشاد
(۱۳) شعبۂ کمپیوٹر
(۱۴) مطبخ۔

موجودہ عہدے اور ذمہ داریاں

ناظم: مرکز احیاء الفکر الاسلامی
مہتمم: جامعۃ الامام ابی الحسن الاسلامیہ
شیخ الحدیث: جامعۃ فاطمۃ الزہراء للبنات
جنرل سکریٹری: دار البحوث والنشر
چیف ایڈیٹر: ماہنامہ ''نقوش اسلام''

والسلام

۲۰؍ستمبر ۲۰۲۱ء محمد عمران قاسمی دیوبندی

باب اول

ولادت، وطن، خاندان، پس منظر اور تعلیم و تربیت

تمہید

اللہ تعالیٰ کا ایک نظام ہے، وہ ہر دور میں ایسے اصحاب ونفوس قدسیہ کو پیدا کرتا رہتا ہے، جو زمانے کے نبض شناس اور وقت کے تقاضوں کو سمجھتے ہیں، اور امت کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں اور انسانیت کی ہدایت ورہنمائی کے لئے پوری جد وجہد اور کوشش کرتے رہتے ہیں، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے ''تاریخ دعوت وعزیمت'' میں اسلام کے بقاء اور تسلسل کے لیے غیبی انتظامات اور دیگر مذاہب پر اسلام کی فوقیت اور برتری کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیے دو انتظامات فرمائے ہیں، ایک تو اس نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کامل ومکمل وزندہ تعلیمات عطا فرما کر مبعوث فرمایا، دوسرے اس نے اس کا ذمہ لیا ہے کہ وہ اس دین کو ہر دور میں ایسے اشخاص عطا فرماتا رہے گا جو ان تعلیمات کو زندگی میں منتقل کرتے رہیں''۔(۱)

چنانچہ اس سنہری زنجیر کی ایک اہم کڑی حضرت مولانا محبوب الرحمٰن ازہریؒ ہیں، جنھوں نے دور حاضر کے فتنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، کبھی بریلویت اور کبھی قادیانیت اور کبھی دیگر فتنوں سے برسر پیکار رہے، اور اسلام کی سربلندی کے لیے حتی المقدور تا حیات کوشاں رہے، آپ کا خاندانی تعلق مغربی یوپی میں مظفر نگر (شاملی) کے مضافات میں ایک تاریخی

(۱) (جلد ۱ر صفحہ ۱۸)

مردم خیز قصبہ کیرانہ سے ہے، جس نے مختلف زمانوں میں علماء، صلحاء، دعاۃ، مصلحین اور تاریخ کی بعض بڑی اہم شخصیات کو جنم دیا ہے، جن میں متکلمین اسلام مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، علامہ نظام الدین کیرانویؒ اور خود مولانا مرحوم کے والد بزرگوار مولانا فضل الرحمٰن کیرانوی ندویؒ قابل ذکر ہیں، کیرانہ کی جن شخصیات نے علم و دین کی خدمت، دعوت وتبلیغ کی جدو جہد، تعلیم وتدریس اور تصنیف وتالیف کے میدان میں زریں نقوش چھوڑے ہیں، ان میں ایک نمایاں نام مولانا محبوب الرحمٰن صاحب ازہریؒ کا بھی ہے۔

مولانا کی پیدائش

مولانا محبوب الرحمٰن صاحب کی پیدائش ۱۹ر فروری ۱۹۱۹ء میں مولانا فضل الرحمٰن صاحب کیرانوی کے گھر یوپی کے مشہور شہر لکھنؤ میں ہوئی، مولانا فضل الرحمٰن صاحب کیرانوی ندوۃ العلماء کے اولین فارغین اور ممتاز فضلاء میں سے اور علامہ سید سلیمان ندوی کے ہم زمانہ وہم درس تھے، وہ کیرانہ ضلع مظفرنگر (شاملی) کے رہنے والے تھے، جو بڑا مردم خیز قصبہ رہا ہے، جہاں کے علامہ رحمت اللہ کیرانوی (۱۸۱۸ء-م ۱۸۹۱ء) مصنف اظہار الحق وبانی مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ تھے۔

مولانا کا وطن کیرانہ

’’کیرانہ کو اس کے فرزندِ جلیل علامہ رحمت اللہ کیرانویؒ (متوفی ۱۳۰۸ھ) اور ان کی شہرۂ آفاق تصنیف ’’اظہار الحق‘‘ سے پوری دنیا میں شہرت ملی‘‘۔

یہ قصبہ جنگِ آزادی میں بھی پیش پیش رہا، مولانا کے والد ماجد مولانا حافظ فضل الرحمٰن کیرانوی ندویؒ (متوفی ۱۹۴۴ء) اسی کیرانہ کی ایک قابلِ قدر شخصیت تھے اور ندوۃ العلماء کے دوسرے بیچ کے چھ اولین طلباء میں چوتھے نمبر کے ندوی تھے، مولانا کا پورا گھرانہ بلکہ

پورا کیرانہ ''حفاظ کا قصبہ'' کی حیثیت سے مشہور تھا، مولانا خود رقم طراز ہیں:

''کیرانہ کا بچہ بچہ حافظ تھا، رمضان میں مسجدوں میں تراویح سنانے کے لئے ہر مسجد میں بیک وقت دو دو حافظ پڑھتے تھے اور پندرہ روز میں ختم ہونے کے بعد دوسرے دو پڑھتے تھے''۔

اب کیرانہ کی آبادی ۲۰۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۸۹۰۰۰ ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔

خاندانی پس منظر

کسی بھی خاندان کی ترقی وتنزلی میں گردوپیش کے ماحول کا ایک اہم رول ہوتا ہے، اس لئے باقاعدہ آپ کے مبارک خاندان کے پس منظر پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔

جیسا کہ معلوم ہوا کہ کیرانہ کو علامہ رحمت اللہ کیرانویؒ اور ان کی شہرۂ آفاق تصنیف ''اظہار الحق'' سے پوری دنیا میں شہرت ملی، ملل ونحل بالخصوص ردعیسائیت سے دلچسپی رکھنے والے اس کتاب سے واقف ہیں، مصر، شام اور حجاز میں اس کے متعدد ایڈیشن اور اس کا خلاصہ منظر عام پر آچکا ہے، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو''نزہۃ الخواطر''۔(۱۶۰۸)

علامہ رحمت اللہ کیرانوی کی حیات وخدمات پر مشتمل اردو میں مولانا سلیم بن محمد سعید (متوفی ۱۹۷۷ء) کی تصنیف موسوم بہ ''ایک مجاہد معمار'' خاصی اہمیت کی حامل ہے، یہ کتاب ہندوستان میں ۱۳۷۶ھ میں شائع ہوئی، پھر ڈاکٹر احمد حجازی القا کے اعتناء سے مصر میں ۱۹۷۷ء میں ''اکبر مجاہد فی التاریخ'' کے نام سے عربی میں منظر عام پر آئی، اس کتاب میں مؤلف نے علامہ کیرانوی کا سوانحی خاکہ، ان کی تصنیفی خدمات، علمی ودعوتی سرگرمیاں، اور عیسائی پادریوں سے مناظرے کی سرگزشت نیز مدرسہ صولتیہ کے قیام کا پس منظر اور اس کے مشاہیر اساتذہ اور فارغین کے اسماء گرامی تحریر فرمائے ہیں، اس فہرست میں مولانا محبوب الرحمٰن کیرانوی ازہری کا نام ۵۷ نمبر پر آتا ہے، کیرانہ کی نابغۂ روزگار ہستیوں میں

علامہ نظام الدین کیرانویؒ کا نام بھی ہے، وہ اپنے زمانہ کے متبحر عالم تھے، درس نظامی کی بیشتر کتابیں مثلاً سراجی، قدوری، مختارات، تہذیب اور شرح تہذیب وغیرہ علامہ موصوف کے گراں قدر حواشی سے مزین ہیں، وہ مولانا عبدالحق خیرآبادی، شیخ الہند مولانا محمودالحسن کے شاگرد اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے فیض یافتہ تھے، کیرانہ کی ایک قابل ذکر ہستی مولانا حافظ فضل الرحمٰن کیرانوی ندویؒ (متوفی اکتوبر ۱۹۴۴ء) کی ذات گرامی بھی ہے، جن کے حلقۂ احباب میں شبلیؒ وسلیمان کے علاوہ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانیؒ، ڈاکٹر سید عبد العلیؒ، حکیم سید عبدالمعیدؒ، ظفر الملک علویؒ (ایڈیٹر الناظر) منشی محمد خلیل نہٹوریؒ، مولانا محمد سعید کیرانویؒ (والد مولانا محمد سلیم مکیؒ) اور مولانا سید علی زینبیؒ جیسی ممتاز اور متنوع الکمالات شخصیتیں شامل تھیں۔(۱)

مولانا کے والد مولانا فضل الرحمٰنؒ ندوی اور دادا حافظ محمد ابراہیمؒ جید حافظ تھے، والد ماجد ۱۹۰۸ء میں فراغت کے بعد ندوہ ہی میں مبلغ ۲۰ روپئے مشاہرہ پر مدرس ہوگئے، اور ۱۹۱۷ء تک مسند درس سے وابستہ رہے، ابتداء ہی سے قناعت، سادگی، زہد وتقوی اور انابت الی اللہ کی دولت پائی تھی، مولانا عین القضاۃؒ لکھنوی نقشبندی مجددیؒ سے بیعت ہوئے تو پھر ندوہ کی ملازمت چھوڑ کر انہیں کے ادارے مدرسہ فرقانیہ میں مدرس ہوگئے۔

۱۹۱۸ء میں حج کے لئے تشریف لے گئے اور عین القضاۃ صاحب کی وفات کے بعد سرہند جاکر خانقاہ مجددیہ کی جامع مسجد میں امامت وخطابت کی ذمہ داری نبھانے لگے۔

مولانا محبوب الرحمٰن ازہریؒ کے والد مولانا فضل الرحمٰن کیرانوی ندوی سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ہم درس واولین ندویوں میں سے تھے، علامہ سید سلیمان ندویؒ اپنے دیرینہ رفیق مولانا فضل الرحمٰن کی وفات پر ''معارف نومبر'' ۱۹۴۴ کے شذرات میں خون جگر سے ماتم کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

(۱) (''معارف''نومبر۱۹۴۴ء)

''علماء ندوہ کی برادری میں یہ خبر بڑے افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ ان کی برادری کے سب سے پرانے رفیق اور دوست حافظ فضل الرحمٰن صاحب ندوی امام وخطیب جامع مسجد خانقاہ مجددیہ، سرہند نے چند ماہ کی علالت کے بعد بمرض استسقاء بمقام مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ بتاریخ ۲۰ر اکتوبر ۱۹۴۴ء بروز جمعہ ۷ بجکر ۴۳ر منٹ شام کے وقت اس دنیا کو الوداع کہا، ان کی عمر غالباً ۶۵ر برس کی ہوگی، کیرانہ، ضلع مظفرنگر ان کا وطن تھا، مگر بچپن میں وہ لکھنؤ آئے اور دارالعلوم ندوہ میں داخل ہوکر متوسطات تک تعلیم پائی، وہ استاذنا جناب مولانا محمد فاروق چریا کوٹی مدرس اعلی کے محبوب شاگردوں میں تھے، صرف ونحو اور ریاضیات سے بڑی دلچسپی اور مہارت رکھتے تھے، مرحوم نے عین جوانی میں انابت إلی اللہ کی توفیق پائی تھی، قناعت پسند، زہد پیشہ، پھر بذلہ سنج ہمیشہ فرحاں وشاداں رہتے تھے، دوستوں کی دوستی میں پائیدار اور مخلص تھے''۔(۱)

''مرحوم نے اپنے دونوں بچوں میں سے بڑے کو جن کا نام مولوی محبوب الرحمٰن ہے، ابتدائی تعلیم ہندوستان میں دلاکر مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ بھیج دیا جہاں وہ کئی سال رہ کر علوم درسی سے فراغت پاکر مزید تکمیل کی غرض سے جامع ازہر چلے گئے، وہاں چھ سال رہ کر قدیم وجدید علوم وفلسفہ وتاریخ اور ادب ودینیات کی تعلیم پائی اور شام وعراق ہوکر ہندوستان واپس آئے اور اس وقت سے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مدرس ہیں، اللہ تعالی ان کو صبر وثبات عطا فرمائے اور اپنے باپ کا حقیقی جانشین بنائے''۔(۲)

مولانا مرحوم کے داماد اور ان کی علمی وادبی وراثت کے محافظ وپاسبان جناب مولانا ابوسحبان صاحب اپنے فاضلانہ مضمون میں رقمطراز ہیں:

''سید صاحب کی یہ دعا مولانا موصوف کے حق میں بارگاہ ایزدی میں قبول ہوئی، بلاشبہ موصوف اپنے والد ماجد کے حقیقی جانشین ٹھہرے اور پوری زندگی صبر وثبات،

(۱) صفحہ ۴۸ مصدر سابق۔ (۲) بانگ حرا خصوصی اشاعت صفحہ ۲۷۔

زہدوتقوی میں بسر کی اورعلم ودین کی خدمت میں مصروف رہے،قرآن کریم سے شغف ان کا خاندانی طرہ امتیاز تھا، وہ خودبھی جید حافظ قرآن تھے،نوسال کی عمر میں قرآن کریم حفظ کرلیا تھااور مسلسل ستر سال نماز تراویح میں قرآن کریم سنایا، روزانہ نماز فجر سے پہلے قرآن کریم پڑھنے کا معمول تھا۔

مولانا مرحومؒ کے خاندان کو ربانی انعام کہاں اور کیسے حاصل ہوا؟ جبکہ موصوفؒ کا مسقطِ رأس لکھنؤ ہے، وہیں پلے، بڑھے اور پروان چڑھے، ساتھ ہی تعلیم وتربیت کا نظم ونسق اور انتظام انصرام ہوا، اس کی وضاحت مولانا موصوفؒ کے الفاظ میں: مولانا فضل الرحمٰن ندویؒ اصلاً کیرانہ، ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے، حافظ فضل الرحمٰن کی والدہ کا انتقال بچپن ہی میں ہوگیا تھا، انکی پرورش ان کی پھوپھی صاحبہ نے کی، جن کے شوہر مولانا عبدالحکیم صاحبؒ تھے، یعنی مولانا عبدالحکیم صاحب مولانا فضل الرحمٰن کے پھوپھا تھے، جو مدرسہ اسلامیہ امدادیہ فتح پور ہنسوہ میں پڑھاتے تھے، وہ سال میں دوتین مرتبہ اپنے وطن کیرانہ جاتے اور واپس آتے، موصوفؒ اپنے ہمراہ فضل الرحمٰن کوبھی لے آئے، جو حافظ ہوچکے تھے، اسی مدرسہ میں ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ بھی پڑھتے تھے، جب ندوہ قائم ہوا تو اس میں سب سے پہلے داخل ہونے والے چھ طلباء میں چوتھا نمبر فضل الرحمٰن کا تھا، ندوہ میں تعلیم حاصل کی، اور فارغ ہوئے، اس کے بعد ندوہ ہی میں مدرس ہوئے اور لکھنؤ کے ہی ہوکر رہ گئے۔

مولانا مرحومؒ اپنے تحقیقی مضمون میں مزید تحریر کرتے ہیں: مولانا فضل الرحمٰن کے والد حافظ محمد ابراہیم صاحب تھے، ان کے والد احمد علی صاحبؒ پٹواری تھے، انگریزوں کا ابتدائی زمانہ تھا، ڈپٹی کلکٹر انگریز تھا، اس نے پٹواریوں کا امتحان لینا شروع کردیا، آخر کار احمد علی صاحبؒ کا بھی امتحان ہوا، وہ اس میں کامیاب ہوگئے، تو انگریز نے کہا، شیخ جی! کوئی تمہارا لڑکا ہے؟ جن کو میں پٹواری بنادوں؟ اس طرح دو دوروں میں دو لڑکے پٹواری بن

گئے، پھر انگریز کا تیسرا دورہ ہوا، تو انگریز نے شیخ جی سے ایک اور لڑکے کو جب پٹواری بنانے کو کہا! تو احمد صاحب برجستہ یوں گویا ہوئے ''بس! تیسرا بیٹا محمد ابراہیم کو میری آخرت کیلئے رہنے دیجئے، شیخ احمد صاحب کے جواب سے کلیم عاجز کا یہ شعر بے ساختہ زباں سے جاری ہوتا ہے ؎

نہ دکھاؤ خواب محل اُسے جسے جھونپڑے کی خبر نہیں

اپنی بات کو عملی جامہ پہنانے کیلئے قدم اٹھایا اور میدان کارزار میں کود پڑے ''عمل جب تک نہ ہوگا قول سے کیا فائدہ ہوگا؟، اپنے لڑکے محمد ابراہیمؒ کو مدرسہ ومکتب سے منسلک کر دیا اور جید حافظ قرآن بنایا، حافظ محمد ابراہیمؒ نے قرآنِ بابرکت کی خدمت کی اور حافظ کے نام سے مشہور ہوئے، ان کے بڑے لڑکے فضل الرحمٰنؒ نے بھی کیرانہ ہی میں حفظ کیا، کیرانہ حفاظ کا قصبہ مشہور تھا، حافظ رحمت اللہ صاحبؒ جامع مسجد میں حفظ کراتے تھے، ان کا اتنا فیض تھا کہ کیرانہ کا بچہ بچہ حافظ تھا۔(۱)

اس خاندان پر بادِ نسیم کے جھونکے چلے اور نئی شبیہ وصورت وجود میں آئی جو تمام آلائش وگندگی سے پاک تھی، اور وہ صورت مولانا محبوب الرحمٰن ازہریؒ کی ہے، چند افراد پر مشتمل یہ مختصر سا گھرانہ پوری سرگرمیوں کے ساتھ سوئے منزل تیز گام تھا، مولانا فضل الرحمٰن ندویؒ تقدیر کے دھنی ہیں کہ محبوب الرحمٰن جیسا اقبال مند بیٹا پایا جو خاندان کا خلف اور سلف کا آئینہ دار ہوا، وہ شجر جس کی شجرکاری وآبیاری احمد علی صاحبؒ نے کی تھی، اب وہ سایہ دار وثمر دار ہوا، ایک ندوی فاضل کی تحریر کے مطابق '' تیز طرار، ذہین وفطین، علم کی سعادت سے معمور ۹ رسال کی مختصر عمر میں کلامِ الٰہی کو اپنے سینے میں محفوظ کر لیا، تجوید وقراءات سبعہ سے فراغت حاصل کی، یہ سعادت بہت کم لوگوں کو میسر ہوتی ہے'' بقول اقبال ''علیہ الرحمہ '' ہر شخص کو ساماں یہ میسر نہیں ہوتا۔(۲)

(۱) بانگ حراء کا خصوصی شمارہ ص۱۰۴/تا۱۰۵۔(۲) صفحہ ۱۳ بانگ حراء نمبر کا خصوصی شمارہ۔

مولانا ازہریؒ کا خانوادہ کثیر العناصر اور بوقلمونی خصوصیات سے مرصع ومزین ہے، اس کی تصویر آپؒ کی ذات میں دیکھی جاسکتی ہے، مولانا مرحومؒ کے خاندان میں حفاظ کرام کی بہتات ہے۔

مولانا ازہریؒ کا خاندان متدین تھا، اثرورسوخ کافی تھا، زیورِ علم وعمل سے مزین و آراستہ تھا، آپ کے سب بھائی، بہن حافظ قرآن کریم ہوئے، اخلاق حسنہ سے منور، شگفتہ سنجی کا پیکر، دل سے زنگ چھڑانے میں صیقل شدہ تلوار اور سلیقہ مندانہ طرز معاشرت کا نمونہ، مولانا کے بھانجے ڈاکٹر نعیم الدین صدیقی کے الفاظ میں: مولانا مرحومؒ کے خاندان کو اللہ نے نعمت عظمیٰ سے نوازا، تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کرتا ہے کہ راقم کا نانیہالی خانوادہ حفاظ وقراء کا مجمع ہے، قرآن کریم کے حفظ وتجوید کے ساتھ اتنے طویل تسلسل اور شدت اہتمام کی نظیر خال خال ہی ملے گی، چنانچہ میرے دونوں ماموں، چاروں خالو اور تمام ماموں زاد وسارے خالوزاد بھائی حفظ قرآن کی دولت سے بہرہ ور ہوئے، فالحمد للہ حمداً کثیراً۔(۱)

مولانا موصوفؒ اپنے بیٹوں کو حفظ قرآن کریم کے موقع پر قابل قدر پند ونصائح کے ساتھ خدمت دین کی تلقین اور اہمیت قرآن کی طرف راغب کرتے ہوئے لکھتے ہیں: تم دونوں ’’بھائیوں‘‘ نے جو کچھ کیا ہے اس کو پختہ کرنے کی ضرورت ہے اور اللہ تمہیں توفیق بخشے کہ قرآن کی صحیح خدمت انجام دو، ہمارے خاندان کی یہی دولت ہے جس پر ہمیں فخر ہے۔(۲)

اجمالاً یہ کہ مولانا ازہری کے خاندان کو اہل علم سے عشق و پیار اور والہانہ عقیدت تھی، اللہ کے بندوں کا صدق دل سے پاس ولحاظ رکھتے، ہر خاص وعام سے ملنے میں دیرینہ تعلق کا اظہار ہوتا، یہ ذہنی وابستگی اور محبت وشیفتگی کی بنیاد محض علمی یا جذباتی نہیں بلکہ درحقیقت

(۱) (بانگ حراء خصوصی شمارہ صفحہ ۳۵۔(۲) (مکتوب ازہری ۳۱؍اگست ۱۹۶۸ء)

اس کی پشت پر گونا گوں محرکات کارفرما ہیں۔

مولانا ازہریؒ کی ناز ونعم میں نشو ونما ہوئی، پدرانہ شفقت، ماں کی محبت، اوراہل خانہ کی طرف سے ہمدردانہ الفت اور کریمانہ ورحیمانہ جذبے ملے، غرض کہ خاندان بھر کے ہر دلعزیز رہے۔

مولاناؒ نے اپنے خاندان کی طرح حصول علم کیلئے عمر دراز کو تج دیا، شب وروز یکساں کدوکاوش میں لگے رہے، فرمانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب عمل استمرار ودوامیت ہے اگرچہ وہ قلیل ہو، کو مدنظر رکھا اور راسخ فی العلم والعمل ہوگئے، دنیا کے شہرہ آفاق ادارہ، عالمی تعلیم گاہ مصر کی قاہرہ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل، سند یافتہ ہوکر مسند درس کی زینت بنے ہیں۔

تعلیم وتربیت

آپ کی تربیت ایسے ماحول میں ہوئی، جہاں علم وعمل کے دیئے روشن تھے، آپ نے حصول علم کے لئے مختلف مراحل طے کئے اور اہم اسفار کئے، چنانچہ آپ کا پورا خاندان علمی اور عملی اعتبار سے بہت ممتاز رہا ہے، اسی کا اثر تھا کہ آپ نے صرف نو سال کی عمر میں قرآن کریم حفظ کرلیا، یوں تو بہت لوگ حفظ کرتے ہیں؛ لیکن اللہ کا آپ پر مزید انعام یہ ہے کہ اللہ نے آپ کو چھوٹی سی عمر میں قرآن کی بیش بہا دولت سے نوازا، درجہ حفظ میں آپ کے استاذ مولانا حافظ غلام رزاق تھے، اس کے بعد آپ مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ میں داخل ہوئے، جہاں حساب، فارسی زبان، تجوید اور قرأت سبعہ میں مہارت حاصل کی، آپ کی عالی ہمتی، جدوجہد، ہونہاری و دانشمندی، ذہانت وفطانت، خوش بختی و نیک طلعتی آپ کے چہرہ پر بچپن ہی سے ہویدا تھی، کہنے والے نے بجا کہا ہے۔

''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات''

آپ کے فرزند ارجمند مولانا سعید الرحمٰن فیضی ندوی (حال مقیم کناڈا) اپنے مضمون میں آپ کے حصول علم کے مختلف مراحل کے بارے میں کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:

''والد مرحوم نے حفظ قرآن مدرسہ فرقانیہ میں مکمل کیا اور وقت کے مشہور قاری جناب عبدالمالک سے قراتِ سبعۃ میں سند لی، دادا جان (مولانا فضل الرحمٰن مجددی ندویؒ) مرحوم نے ابتدائی عربی تعلیم کا انتظام اپنی زیرنگرانی مدرسہ فرقانیہ میں کیا، مزید تعلیم کے لئے مولانا مفتی محمد ظہور صاحب بہاریؒ کا انتخاب کیا، ساتھ ہی ساتھ دادا جان اپنے بعض مشہور شاگردوں کے پاس والد صاحب کو روزانہ پابندی سے بھیجا کرتے تھے، جو اس وقت دارالعلوم ندوۃ العلماء میں استاد تھے، اس کے علاوہ فرنگی محل کے اساتذہ سے بھی والد صاحب نے استفادہ کیا''۔

پھر مولانا کی بلند ہمتی، خوش بختی اور علم کی جویا طبیعت نے ترکِ وطن پر آمادہ کیا، وہ درجاتِ ثانویہ کی تعلیم کے لئے اس وقت مشرقِ وسطیٰ کی اہم دینی درسگاہ مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ بھیجے گئے، اس درسگاہ میں وقت کے جید علماء تدریس کے منصب پر فائز تھے، یوں مولانا مدرسہ فرقانیہ، فرنگی محل اور ندوۃ العلماء سے کسبِ فیض کرنے کے بعد بیت اللہ کے زیرِسایہ مدرسہ صولتیہ اور علمائے حرم کے دروس کے چشمۂ صافی سے نہال ہوتے رہے۔

۱۹۳۸ء میں مدرسہ صولتیہ سے فراغت کے بعد عالمِ اسلام کی سب سے عظیم یونیورسٹی جامع ازہر تشریف لے گئے، وہاں آپ نے کلیۃ اصول الدین میں داخلہ لیا، اور وہاں کی تعلیم مکمل کر کے عالیہ کی ڈگری حاصل کی، یہ دوسری عالمی جنگ ۱۹۴۲ء کا زمانہ تھا، مکہ مکرمہ کے قیام کے زمانے میں جامع ازہر کے متعدد اساتذہ سے ملاقاتیں اور شناسائی رہی تھی، یہ حضرات مولانا کی عربی زبان وادب کے ذوق اور حفظِ قرآن وتجوید کی پختگی سے متعارف ومتاثر تھے، یہ شناسائی یہاں کام آئی، یہیں آپ کی ملاقات مولانا عمران خاں ازہری ندویؒ، سعد الباری اور مولانا محمد حسین بھٹکلی ازہری سے ہوئی۔

باب دوم

درس وتدرس،نگرانی اورندوۃ العلماء

تمہید

حضرت مولانا محبوب الرحمٰن صاحب ازہری نے جامعہ ازہر مصر سے فراغت کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریسی خدمات انجام دیں، سات سال بعد کلکتہ مدرسہ عالیہ میں تدریسی کام کیا، اور تیئیس سال بعد ریٹائرڈ ہوکر دوبارہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں آ گئے اور پھر تادم واپسیں درس وتدریس اورنگرانی کے فرائض انجام دیتے رہے اورندوۃ العلماء کے ہو کے رہ گئے۔

تدریس کا دوراول

حضرت مولانا محبوب الرحمٰن ازہری کے ندوۃ العلماء میں تدریس کے دو دور ہیں، ایک تو ۱۹۴۲ء میں جب جامعہ ازہر مصر سے آپ نے الاجازۃ العالیہ (بی اے) کی ڈگری لی، اور ہندوستان واپس آئے، تو اپنے والد کے مشورے سے ندوۃ العلماء لکھنؤ میں عربی زبان وادب کے استاذ ہوگئے، اس وقت یہاں کے معتمد تعلیمات علامہ سید سلیمان ندویؒ تھے، انہوں نے ہی آپ کا انٹرویو لیا تھا، جبکہ مہتمم مولانا عمران خان ندویؒ تھے، جو خود ازہری تھے، نظامت کے منصبِ جلیل پر ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ فائز تھے، مولانا اساتذہ میں

سب سے کم سن استاذ تھے، اور بقول مولانا مفتی محمد ظہور صاحب: ’’بعض طلبہ مولانا سے عمر میں بڑے تھے‘‘ اس طرح جوانی اور شباب میں مولانا نے اپنی تدریسی صلاحیت کے جوہر دکھائے اور طلبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کو اپنی علمی صلاحیت سے سیراب کیا، دارلعلوم میں تدریس کا یہ دوراوّل تھا جو ۱۹۴۹ء تک محیط رہا۔

تدریس کا دور ثانی

دبستانِ شبلیؒ ومونگیریؒ ندوۃ العلماء میں اپنے خلوص، دلجمعی اور معلّمانہ ومشفقانہ تعلیم وتربیت کے نقوش چھوڑنے کے بعد آپ ۱۹۴۹ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ تشریف لے گئے، دراصل بات یہ تھی کہ ۱۹۴۷ء کی آزادی اور ملک کی تقسیم سے مدرسہ عالیہ کلکتہ بھی منقسم ہوئے بغیر نہیں رہ سکا اور اس کا پورا تعلیمی سسٹم پارہ پارہ ہوگیا، ۱۹۴۹ء میں مولانا ابوالکلام آزاد دوبارہ سابقہ شان وشوکت کے ساتھ اس کی ساکھ بحال کرنا چاہتے تھے، اور مشاہیر علماء وفضلاء کو دعوتیں دے رہے تھے، ان کی دعوت پر اکابر اور تجربہ کار علماء وفضلاء کی ایک چیدہ جماعت وہاں جمع ہوگئی، ستاروں کے اس جھرمٹ کا ایک تابندہ ستارہ مولانا محبوب الرحمٰن ازہریؒ تھے۔

کلکتہ روانگی

چنانچہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں سات سال گذار کر ۱۹۴۹ء میں اسے خیرباد کہا اور مدرسہ عالیہ کلکتہ میں تقرری کیلئے انٹرویو دیا، جس کا تذکرہ مفتی محمد ظہور صاحب ندوی نے یوں کیا ہے ’’آپ نے مدرسہ عالیہ کلکتہ میں انٹرویو دیا اور کامیاب ہی نہیں ہوئے بلکہ جس نے انٹرویو لیا وہ آپ کی حاضر جوابی اور علمی صلاحیت سے اس قدر متاثر ہوا کہ بعض چیزیں جو سرکاری طور پر مطلوب ہوتی ہیں ان کو نظر انداز کر دیا‘‘۔

بہر حال! اس عرصہ میں آپ نے عربی زبان وادب کے لکچرار کا عہدہ قبول کیا اور ایک لمبا عرصہ گذارا، اس عرصہ میں آپ کے تعلقات کافی بارسوخ شخصیات سے رہے لیکن کبھی ان سے ذاتی فائدہ اٹھانا تو دور انتفاع کیلئے کبھی سوچا بھی نہیں، بلکہ سب کے محتسب ہی رہے، وہاں آپ نے کئی یادگار کارنامے انجام دیئے لیکن بالخصوص دو کارنامے نہایت ہی قابل ستائش اور داد وتحسین کے مستحق ہیں۔

آپ نے ''المنتخبات العربیۃ'' عربی زبان کے ادیب وشاعر اور مایۂ ناز محقق علامہ ابومحفوظ الکریم معصومی (متوفی ۲۰۰۹ء) کی مشارکت میں ترتیب دی، جو مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے مقدمہ سے آراستہ ہوکر عثمانیہ بک ڈپو کلکتہ سے ۱۹۵۷ء میں منظر عام پر آئی، یہ شعری مجموعہ مدرسہ عالیہ کے نصاب درس میں شامل ہے۔

فرق باطلہ بالخصوص قادیانیت کا گہرائی وگیرائی سے مطالعہ کیا اور اس کی خرافات کے ابطال کے لئے کمر بستہ ہوئے، قادیانیوں کو حج بیت اللہ سے روکنے میں اہم رول ادا کیا اور اس سلسلے میں شاہ فیصل مرحوم سے مراسلت بھی کی، چونکہ ردقادیانیت آپ کی زندگی کا مشن تھا اور ہوتا بھی کیوں نا جبکہ بقول خود مرزا غلام احمد قادیانی ''قادیانی فرقہ انگریزوں کا خودکاشتہ پودا ہے''۔

مختصر یہ کہ دین فروشی، ملت فروشی، غیرت فروشی، خوشامد، لجاجت، التجا، التماس یہ خلاصہ تھا قادیانی سیاسیات کا، اور اس کے تحت انگریزی سرکار کی وفاداری جزء ایمان قرار دی گئی، نیز بقول مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ ''قادیانیت ایک مستقل مذہب ہے اور قادیانی مستقل امت، یعنی اس کے ایک ایک جزء میں ہمیں اختلاف ہے''۔

قادیانیت کی اس تباہ کاری کے پیش نظر ردقادیانیت میں آپ کی تصنیف ''سفر قادیان''

ہے،جس کا تعارف اس کتاب کے مقدمہ نگار، امت مسلمہ کی معتبر ترین شخصیت مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب نے یوں کرایا ہے'' آپ نے فرقہ کے امام غلام احمد کی ان حرکتوں کا انکشاف کیا ہے جس سے ان کا اسلام کے بنیادی اور لازمی احکام کے خلاف ہونا ثابت ہوتا ہے''۔

اس طرح کلکتہ میں مولانا کی تدریسی، تعلیمی اور دعوتی خدمات کے ساتھ عوام میں دینی بیداری، فرقہ باطلہ سے مقابلہ اور مناظرہ کا بھی سلسلہ رہا اور آپ کا کلکتہ کا زمانہ قیام وہاں کا عہد زریں کہلانے کا مستحق ہے، آپ کا علمی فیض بھی خوب ہوا اور دعوتی اور اصلاحی فیض بھی خوب ہوا، اور ایک زبردست داعی اور مجاہد کی طرح وہاں آپ نے زندگی گزاری، جو زندگی آپ کے مآثر اور کارناموں سے بھری پڑی ہے، اس طرح تدریس کا دوسرا دور کلکتہ میں ۱۹۷۷ء میں ختم ہوا۔

تدریس کا دور ثالث

تیسرا دور ۱۹۷۷ء سے شروع ہوتا ہے، جب آپ مدرسہ عالیہ کلکتہ سے ریٹائرڈ ہوکر ندوۃ العلماء تشریف لائے اور پھر تادم حیات ندوہ میں اپنی خدمات انجام دیں۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ کے تیس سالہ تدریسی مشغولیت کے زمانے میں ہزاروں طلبہ کو انہوں نے ذرہ سے مہتاب بنایا، مضافاتِ کلکتہ میں اصلاحی، دعوتی اور ردِّ قادیانیت کے سرگرم سپاہی بنے رہے، اس عرصے میں ندوۃ العلماء کے اکابر علماء سے تعلق خاطر میں شدت آتی گئی، پھر ۱۹۷۷ء میں ریٹائرڈمنٹ کے بعد ندوۃ العلماء آگئے اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی خواہش ومنشاء کے مطابق دارالعلوم میں تدریسی خدمات پر مامور ہوئے، آپ کے صاحبزادے ڈاکٹر سعید الرحمٰن فیضی ندوی تحریر فرماتے ہیں:

''والد مرحوم کلکتہ کی ملازمت سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد اپنی اصل کی طرف لوٹ

آئے اور اپنی زندگی کے باقی ایام (تقریبا ۳۳ سال) دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لئے وقف کردئے'' دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریس کا یہ دور ثانی تھا۔

یہاں آپ تفسیر، حدیث ،عربی زبان وادب، منطق وفلسفہ اور مذاہب وادیان کے مضامین پڑھاتے تھے،مولانا ضیاءالحسن ندوی کی ۱۹۸۹ء میں وفات کے بعد صحیح بخاری اور مولانا ابوالعرفان ندوی کی ۱۹۸۸ء میں وفات کے بعد ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کی تکمیل فرمائی، جب'' صحیح بخاری'' کی تکمیل کیلئے آپ کے نام کا اعلان کیا گیا تو چہ می گوئیاں شروع ہو گئیں کہ عربی زبان وادب کے استاذ'' صحیح بخاری'' کا درس کیسے دیں گے؛لیکن جب درس دیا تو ان کے اس درس میں شمولیت کا شرف حاصل کرنے والے آفتاب عالم صاحب ندوی کے بقول'' اگر چہ آپ کی شہرت زبان وادب کے رمز شناس کی حیثیت سے تھی ؛لیکن جب علوم عالیہ اور شرعیہ کی تعلیم وتدریس کے میدان میں قدم رکھا تو لگا کہ ؎

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

آپ کا طرز تدریس الگ انداز کا ہوتا تھا،عربی لہجہ،عربوں جیسا ہی تھا،آپ طلباء سے بے تکلف ہوکر عربی اور اردو دونوں زبانوں میں پڑھاتے تھے لیکن تشریح زیادہ تر عربی زبان میں ہی کرتے تھے۔

تدریسی خدمات کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ آپ دارالعلوم کے نگران اعلیٰ کے منصب پر بھی فائز رہے اور اس عہدہ پر بھی چھوٹے بڑے سب کے خیرخواہ رہے۔

کامیاب مدرس

مولانا ایک کامیاب مدرس تھے،آپ کی علمی اور تدریسی صلاحیتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء) فرماتے ہیں:

'' وہ دینی علوم اور زبان وادب میں امتیاز رکھتے تھے،عربی زبان کی تدریس کا ان کو اچھا

ملکہ تھا،اور اس سلسلے میں مہارت حاصل تھی،آپ نے دارلعلوم ندوۃ العلماء میں حدیث شریف کی اہم کتابوں کا درس دیا اور کچھ وقت صحیح بخاری اور مسلم شریف جیسی عظیم کتابوں کا بھی درس ان کے ذمہ رہا......(انہوں نے) دارالعلوم ندوۃ العلماء کو اپنے علمی تعاون اور گراں قدر مشوروں سے تقویت پہنچانے کا سامان فراہم کیا''۔

آپ کے طرزِ تدریس سے متعلق آپ کے شاگرد رشید مولانا سید محمد واضح رشید ندویؒ (سابق معتمد تعلیمات ندوۃ العلماء) یوں اظہار خیال فرماتے ہیں:''عربی زبان وادب کے استاذ کی حیثیت سے دارالعلوم میں آپ کا تقرر ہوا اور بہت جلد اپنے جداگانہ اندازِ تدریس کی وجہ سے ذمہ داروں کی توجہ کا مرکز بن گئے،خاص طور پر عربی زبان وادب کے پڑھانے میں مولانا کا خاص طرز تھا،جس کے مولانا ہی بانی تھے،اس طرح عربی بولنے اور طلبہ میں عربی ذوق پیدا کرنے میں انہیں بڑی مہارت حاصل تھی''۔

عربی زبان وادب کا پاکیزہ ذوق

مولانا نے حرمِ کعبہ کے نورانی ماحول،مدرسہ صولتیہ کی علمی فضا اور ازہر جیسی عظیم دانش گاہ میں اہل زبان کے درمیان مدتوں رہ کر کسبِ فیض کیا تھا،اس صحبت نے ان کی عربی زبان کی صلاحیت کو پختہ،ذوق کو پاکیزہ،لب ولہجہ کو نطق اعرابی بنادیا تھا،آپ کو عربی زبان کے رموز واسرار پر ید طولیٰ حاصل رہا،مولانا سید محمد رابع ندوی دامت برکاتہم جو خود اس دریا کے شناور ہیں،شہادت دیتے ہیں:''وہ دینی علوم اور عربی زبان وادب میں امتیاز رکھتے تھے''۔

اور مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن ندوی فرماتے ہیں:''میں نے مولانا محبوب الرحمٰن ازہریؒ کی زبان سے عربی لہجہ اور اسلوب میں تقریر سنی تو اس کا مجھ پر ایک عجیب تاثر ہوا''۔

مولانا فطری طور پر معلم ومدرس تھے،تعلیم وتدریس سے آپ کا شوق والہانہ تھا،کبرِ سنی

اورامراض کے باوجودندوۃ العلماء میں درس کاناغہ نہ کرتے تھے۔

علمی گہرائی

مولاناجامع ازہر(مصر) سے کندن بن کر ہندوستان لوٹے،آپ سے استفادہ کرنے والےاہل علم کی ایک بڑی جماعت ہے،ایک ندوی فاضل فرماتے ہیں:

''مولانا کے سامنے جب کوئی پیچیدہ مسئلہ آتا،کبھی یہ نہیں ہوا کہ وہ اس دشواری اور پیچیدگی کاحل کرنے کااثر طبیعت پرلیں، بلکہ وہ مسئلہ کو ہنستے کھیلتے چٹکیوں میں حل کرتے تھے''۔

مولاناکےایک شاگردمحمد طارق غازی کینیڈااپنےتعزیتی ای میل میں کہتے ہیں:

''ایک بار کوئی صاحب حکیم زماں (کلکتہ) کے مطب پر ترکہ اور وراثت کا مسئلہ دریافت کرنے آئے،توانہوں نے ان کومولاناازہری کے پاس جانے کامشورہ دیااور مجھ سے کہا کہ مولاناازہری اس دقیق علم کےایسےزبردست ماہر ہیں کہ قرابت داریاں کتنی بھی الجھی ہوئی کیوں نہ ہوں،وہ بہ سہولت شرع کےعین مطابق تصفیہ کردیتے ہیں،واقعہ یہ ہے کہ کلکتہ میں ان سے بڑااس علم کاکوئی ماہرنہیں تھا''۔

قرآن کریم کاذوق اوراس سلسلہ میں آپ کی کوششیں

قرآن کی ہی خدمت کانتیجہ تھا کہ اللہ نے آپ کوایسانوازا کہ متعدد بارتاجدار بطحاء کی سرزمین حرمین شریفین مکہ مکرمہ کےاندرعالمی مسابقہ میں بحثیت حکم کےتشریف لے گئے، ایک بارآپ کو یہ احساس پیدا ہوا کہ ندوہ کےطلباءبھی اس عالمی مسابقے میں شرکت کریں، چنانچہ ہندوستان میں پہلے ایک مسابقہ ہوتا،جواس میں پاس ہوتا،اس کومکہ مکرمہ بھیجاجاتا، اور یہ مولانامرحوم کی کوششوں کانتیجہ تھا کہ ۱۹۹۷ء میں پہلی بارندوہ کے طالب علم غزالی اور

اسحاقؒ مکہ مکرمہ مولانا مرحوم کے طفیل سے گئے، اس کے بعد یہ ہوا کہ ندوہ سے صرف ایک طالب علم ہی جاسکتا ہے، چنانچہ ایک موقع پر قادیانیت کے موضوع پر ندوہ میں ایک میٹنگ بلائی گئی جس کے اندر امام حرم دکتور حسن باجودہ تشریف لائے، مولانا مرحوم نے ان کو ندوہ کی زیارت کرائی، اس وقت مولانا مرحوم نے امام حرم سے عالمی مسابقہ میں ندوہ کے طلباء کے لیجانے کی بات کی، تو انھوں نے صرف ایک طالب علم کی اجازت دی۔

مولانا طٰہٰ ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، خود اپنی زبانی یہ بیان کرتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ کا احسان عظیم ہے کہ اس نے قرآن مجید کو اچھا پڑھنے کی بدولت اور مولانا ازہری کی کدوکاوش کے نتیجے میں حرمین شریفین کی زیارت سے نوازا''۔

مولانا کی جامعیت

حضرت مولانا واضح صاحب لکھتے ہیں کہ ''مولانا کی ایک خصوصیت ان کی جامعیت تھی، وہ جس طرح عربی زبان وادب کے مثالی استاد تھے، وہ دوسرے موضوعات کی اعلی کتابیں بھی پڑھاتے اور تنظیمی ذمہ داریاں بھی انجام دیتے تھے، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں صحیح بخاری کے استاد مولانا ضیاء الحسن اعظمی ندوی کا جب انتقال ہوا اور درمیان سال کی وجہ سے یہ خلا زیادہ محسوس کیا گیا تو مولانا محبوب الرحمٰن ازہری مرحوم نے صحیح بخاری شریف کی تدریس کی ذمہ داری عارضی طور پر قبول فرمائی اور اس طرح حدیث میں بھی اپنی اعلی صلاحیت اور علم سے طلبہ کو مستفید کیا۔

آگے لکھتے ہیں کہ ''مولانا ایک مثالی استاد، مثالی داعی، مربی اور مثالی انسان تھے''۔

ایک ندوی فاضل لکھتے ہیں: ''مولانا کا تدریسی دور بھی دارالعلوم ندوۃ العلماء سے شروع ہوتا ہے اور مدرسہ عالیہ کلکتہ میں ٹھہرتا ہوا پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں پڑاوڈال دیتا ہے، یہ آپ کی تدریسی، تربیتی، اصلاحی، دعوتی اور سنجیدہ تحریری مناظرانہ خدمات کا خاموش

لیکن مؤثر اور سبق آموز دور ہے، مولانا اپنی بہت سی خصوصیات میں مدرسین اور اصلاحی کام کرنے والوں کے لئے ایک آئیڈیل کی حیثیت رکھتے تھے''۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا کو صحاح ستہ بشمول مسلسلات اور جملہ مرویات کی اجازت محدث الحرمین شیخ عمر حمدان محرسی سے حاصل تھی، مولانا ازہریؒ ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ اور تاج المساجد بھوپال کے مجلس شوریٰ کے رکن رکین بھی تھے۔

کہیں مدت میں ساقی بھیجتا ہے ایسا مستانہ
بدل دیتا ہے جو بگڑا ہوا دستورِ میخانہ

ندویانہ مزاج کے حامل اور امین

مولانا اول تا آخر ندویانہ مزاج کے حامل بلکہ امین رہے، وسعتِ فکر ونظر، اعتدال وتوازن، عقیدہ میں پختگی، فقہی وفروعی امور میں توسع، فکری انحرافات سے گریز اور دین کی ابدیت وحقانیت پہ کامل یقین جیسی ساری ندویانہ صفات کے آپ جامع تھے، بلکہ ایک ندوی فاضل کے الفاظ میں آپ ندوۃ العلماء کے لئے آئیڈیل تھے، فرماتے ہیں:

''مولانا میرے نزدیک تحریکِ ندوۃ العلماء کے لئے آئیڈیل تھے، تحریکِ ندوۃ العلماء کے اگر عمدہ، بہترین اور کامیاب نمونے متعین کئے جائیں تو آخری دور میں مولانا محبوب الرحمٰن ازہریؒ بھی ایک بہترین نمونہ تھے''۔

مولانا مرحوم اور دار العلوم ندوۃ العلماء

مولانا کے عزیز ترین خویش مولانا ابوسحبان روح القدس کہتے ہیں:

''مولانا ازہری ندوۃ العلماء سے محبت وتعلق میں اپنی مثال آپ تھے، بلا ناغہ ہر روز دار العلوم تشریف لاتے رہے''۔

مولانا کے بھانجے ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی فرماتے ہیں: ’’ندوہ ان کی روح بن چکا تھا، وہاں جانے سے ان کو طاقت کا ٹانک حاصل ہوا کرتا تھا‘‘۔

اس سلسلہ میں مولانا مرحوم کی بیٹی رفعت محبوب سے زیادہ سچی بات اور کون بتا سکتا ہے چنانچہ ندوہ سے آپ کا تعلق اور ندوہ کے اندر آپ کی خدمات کے سلسلہ میں اپنے مضمون میں تحریر فرماتی ہیں:

’’ندوہ سے ان کا خاص لگاؤ تھا، کبھی ہماری امی کہتی تھیں کہ ندوہ میں شاید میری سوکن ہے، جس سے یہ ہر روز ملنے جاتے ہیں، ندوہ کی زیارت کے بغیر تو شاید ان کا کھانا ہی ہضم نہ ہوتا تھا، حضرت مولانا علی میاںؒ سے خاص لگاؤ تھا، اکثر ان سے اپنے ذاتی مشورے بھی کرتے تھے، کلکتہ سے ریٹائرمنٹ کے بعد جب لکھنؤ واپس آئے تو مولانا علی میاںؒ سے کہا کہ مجھے رامپور، سعودی ایمبسی اور جامعہ محمد یہ مالیگاؤں وغیرہ میں بلایا جارہا ہے تو حضرت مولاناؒ نے کہا کہ کچھ بھی فیصلہ کرنے سے پہلے مجھ سے ایک بار بات کرلیجئے گا، اور جب بات کی تو کہا آپ ندوہ میں رک جایئے، میری یہی خواہش ہے، حالانکہ اس وقت ہمارے کوئی بھی بھائی برسر روزگار نہ تھے، اور ہم سبھی تعلیم حاصل کررہے تھے، اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو ان کی بے لوث ندوہ کی خدمت کرنے کے صلہ میں ایک مکمل اور خوبصورت زندگی عطا کردی ہے، اس کے لئے خدائے تعالیٰ کے بعد ہم سبھی اپنے والد کے احسان مند ہیں جن کی بے لوث دینی خدمت کے بدلے آج ہم سبھی سکون محسوس کررہے ہیں، یہ تھی ان کی صبر وقناعت کی ایک مثال‘‘۔

مولانا مرحوم کے بیٹے مولانا سعید الرحمٰن فیضی ندوی (حال مقیم کناڈا) اپنے مضمون میں مولانا مرحوم کا ندوہ سے تعلق بتاتے ہوئے یوں تحریر فرماتے ہیں۔(۱)

والد محترم کو تحریک ندوۃ العلماء سے تعلق ومحبت ورثہ میں ملا تھا، یہ تعلق روز اول سے

(۱) خصوصی نمبر ’’بانگ حراء‘‘ صفحہ ۴۸۔

رہا ہے، چنانچہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تاسیس کے بعد سب سے پہلے جن طلبہ نے اس جدید درسگاہ میں داخلہ لیا ان میں دادا جان مرحوم کا نمبر چوتھا تھا، انہوں نے ایک صدی قبل ۱۹۰۸ء میں سند فراغت حاصل کرنے کے بعد وہیں ایک عرصہ تک تدریسی خدمت انجام دی، وہ مشہور عالم دین مولانا فاروق چریا کوٹیؒ کے شاگرد علامہ شبلی نعمانیؒ کے معتمد اور حضرت سید صاحبؒ (علامہ سید سلیمان ندویؒ) کے ہم درس وصدیق تھے''۔

ندوہ میں نگران اعلی

اخیر دور میں مولانا محبوب الرحمٰن صاحب ندوہ میں نگران اعلی کی حیثیت سے رہے، حضرت مولانا محمد رابع صاحب اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں:'' دارالعلوم ندوۃ العلماء میں طلبہ کی نگرانی اور رہنمائی کی ذمہ داری بھی کچھ عرصہ انجام دی، اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کو اپنے علمی تعاون اور گرانقدر مشوروں سے تقویت پہنچانے کا سامان فراہم کیا، انہوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اپنے آغاز جوانی سے تدریسی خدمت کی تھی، چنانچہ آج دار العلوم کے بعض سینئر اور ذمہ دار اساتذہ ان کے شاگردوں میں ہیں۔

مولانا مرحوم ایک مثالی نگراں تھے

اخیر دور میں ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ سالانہ امتحان کے موقع سے طلباء کی وضع قطع چیک ہورہی تھی، ایک طالب علم کے بال بہت بڑے تھے، اس نے نادانی میں ضابطے کے مطابق بال نہیں کٹوائے، مولانا نے اس کو امتحان کارڈ نہیں دیا، وہ طالب علم آخر تک حجت کرتا رہا، اور امتحان بھی شروع ہوگیا، یہ نوعمر طالب علم مولانا سے سخت گستاخانہ لہجہ میں پیش آیا، وہاں پر بیٹھے ہوئے اساتذۂ کرام نے یہ منظر دیکھا اور سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور ان پر اس کی یہ بدکلامی برداشت نہ ہوسکی، مولانا نے ان کی ناپسندیدگی کو محسوس کرلیا، قبل اس

کے کہ آپ کے محبین کچھ کریں، مولانا ان کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمانے لگے کام کرنے کے لئے تو یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑے گا، اساتذہ کرام نے مولانا سے فرمایا کہ اس طالب علم کا اخراج ہونا چاہئے، یہ کسی طرح معافی کے لائق نہیں ہے اور اس موقع پر جذباتی انداز سے جو کچھ کہہ سکتے تھے وہ کہا، لیکن اللہ اکبر، مولانا کا تحمل اور عملی حلم آج بھی ہمارے لئے درس عبرت بنا ہوا ہے، مولانا نے حضرت علیؓ کے چہرے پر دشمن کے تھوکنے اور تلوار کو نیام میں کر لینے کا واقعہ سنایا اور فرمایا اب اس کا اخراج کرنا اپنے لئے ہو جائے گا، پھر گھر میں باپ بیٹے، چچا بھتیجے کے اختلافات اور عدم اطاعت کی مثالیں دیتے رہے، مولانا کا یہ عملی درس قلب و دماغ میں ہمیشہ کیلئے نقش ہو گیا، اس مدت میں مولانا مرحوم نے اپنے کسی بھی ملازم کو جھڑکا نہیں، دفتر کے ایک خادم امتیاز خاں غازی پوری نہایت ہی درد بھرے انداز میں بیان کرتے ہیں۔

مولانا کے دفتر کے ملازم کا ایک واقعہ

''حضرت مولانا محبوب الرحمٰن ازہری جس زمانہ میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں نگرانِ اعلیٰ تھے، ان دنوں مجھے ان کے دفتر میں ان کی خدمت کا موقع ملا اور تقریباً آٹھ نو سال مولانا کی خدمت نصیب ہوئی، جس کی بنا پر آپ کی مثالی زندگی سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا، آج بھی مولانا کی بہت سی باتیں یاد آتی ہیں، ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ داخلہ کا زمانہ تھا، مولانا نے مجھ سے فرمایا امتیاز داڑھی رکھ لو، میں نے کہا جی رکھ لوں گا، کہنے لگے جانتے ہو میں نے کیوں کہا تم سے داڑھی رکھنے کو، میں نے کہا جی میں نہیں جانتا، تو مولانا کہنے لگے ہم طلبہ کی وضع قطع چیک کرتے ہیں، اب اگر ہم لوگوں ہی کی وضع قطع درست نہ ہوگی تو طلبہ یہ اعتراض کریں گے کہ آپ کے دفتر کا ملازم تو داڑھی نہیں رکھتا اور ہم لوگوں پر سختی کرتے ہیں، بس اسی وقت میں نے داڑھی رکھ لی، طلبہ ہوں یا ملازمین، مولانا ہر ایک کو

محبت کے ساتھ سمجھاتے ،حقیقت یہ ہے کہ مولانا ایسی انوکھی خصوصیات کے مالک تھے کہ میرے لئے ان کوالفاظ کے پیکر میں ڈھالنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے''۔

مولانا زبردست انتظامی صلاحیتوں سے مالا مال تھے

مولانا مرحوم کی شخصیت ہمہ رنگ وہمہ گیر تھی ،موصوف جہاں ایک طرف علم کے بلند مقام پر فائز تھے، وہیں دوسری طرف خدائے ذوالجلال نے انہیں زبردست انتظامی صلاحیتوں سے نوازا تھا، وہ کسی بھی کام کو انتہائی خوش اسلوبی ،حسن سلیقہ اور حکمت سے انجام دیتے ، وہ رواقہائے دارالعلوم کے نگراں اعلی Cheif warden تھے، اور نگرانی بہت ہی ذمہ دارانہ اور نازک کام ہے کیونکہ طلبہ کو ڈیل کرنا ایک بہت بڑا فن ہے، چونکہ اس میں مختلف مزاج کے طلبہ ہوتے ہیں ، کچھ سعادت مند، کچھ شریر، گویا کہ وہ چھوٹی موٹی عدالت ہوتی ہے، جہاں متنوع مسائل پیش ہوتے ہیں،اس کو تحمل وبردباری،خوش اسلوبی سے سلجھانا پڑتا ہے،اس کے لئے بیدار مغزی اور دانائی درکار ہے۔

مولانا کی نگرانی کے سلسلہ میں ایک فاضل کی شہادت

مولانا مثالی نگراں اعلی رہے، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فاضل استاذ شیخ ابرار ندوی جنہیں کافی دنوں تک مولانا کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا، وہ مولانا کی دانشمندی، بردباری،تحمل اور نرم خوئی ودوراندیشی کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''مجھے بلا انقطاع مولانا علیہ الرحمہ کے ساتھ تین سال رہنے کا موقع ملا، میں نے مولانا کوایک مخلص اور عملی شخص پایا،مولانا نگران اعلی کی حیثیت سے طلبہ کے سلسلہ میں جب کوئی اہم فیصلہ لیتے تو دوسرے نگراں حضرات کی رائے ضرور لیتے ،نگراں حضرات کی رائے لئے بغیر کوئی حتمی رائے قائم نہ فرماتے اور ہمیشہ کہا کرتے ......میں اجتماعیت کا قائل ہوں،

انفرادیت اسلام میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہے، نگراں صاحبان کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے اور فرمایا کرتے اصل کام تو آپ حضرات ہی کرتے ہیں میں تو دستخط کرتا ہوں، اسی طرح طلبہ سے اپنا ذاتی کام لینا بھی گوارانہ تھا، فرماتے ہدیہ لینا، کام کرانا، یہ ضابطہ کے نفاذ میں حجاب بنتا ہے، یہی وجہ تھی کہ آپ کے یہاں اصول وضوابط کے نفاذ میں کوئی لچک نہیں تھی، ضابطہ کا نفاذ تمام طلبہ پر یکساں ہوتا۔

اپنے سے چھوٹوں اور نگراں صاحبان کی ضابطہ کے دائرہ میں پوری رعایت کرتے، ہر ایک کی بات توجہ سے سنتے اور اہمیت دیتے، سبھی کی ذاتی ضرورتوں میں بھی خوشدلی سے تعاون فرماتے، اور اپنے میں ایسے محتاط کہ دارالعلوم سے ذاتی فائدہ تو دور کی بات ہے جائز حق بھی روا نہیں سمجھتے تھے۔ (بحوالہ بانگ حرا خصوصی اشاعت صفحہ ٨١)

تحریک ندوہ کے آئیڈیل

کلکتہ سے دارالعلوم ندوۃ العلماء واپسی کے بعد سے وفات تک تقریباً ٣٣ رسال اس ادارہ سے منسلک رہے، اور بقول ایک ندوی فاضل ''میرے نزدیک آپ تحریک ندوۃ العلماء کیلئے آئیڈیل تھے، تحریک ندوۃ العلماء کے اگر عمدہ، بہترین اور کامیاب نمونے طے کئے جائیں تو اس آخری دور میں آپ بھی ان میں ایک بہترین نمونہ تھے، آپ ندوی الفکر تھے، اور ندوی تشخص کی حسین قوس وقزح کہ ندوی ایک آفاقی ذہن رکھتا ہے، اس کے اندر عالمیت ہوتی ہے، اس لئے وہ مختلف علاقوں کے مختلف جھگڑوں، جماعتوں، تحریکوں، فرقوں اور مسلکوں کے خرخشوں سے اپنے کو محفوظ رکھتا ہے اور ہر مجلس میں وہ بات کہتا ہے جو اس کے مناسب اور شایان شان ہو یعنی ''كلموا الناس على قدر عقولهم أتريد أن يكذب الله ورسوله'' کی ہدایت ان کے پیش نظر رہتی ہے اور یہ بات آپ کے اندر بدرجہ اتم موجود تھی''۔

بھٹکل میں مسلک شافعی کی رعایت

جس کی بین مثال مولانا عبدالسلام خطیب بھٹکلی ندوی کی زبانی سنئے ’’جامعہ اسلامیہ بھٹکل میں آپ ۱۹۸۸ء میں تشریف لائے اور کافی دنوں تک قیام فرمایا، اس درمیان فجر کی نماز آپ ہی پڑھاتے تھے اور فجر کی دوسری رکعت میں رکوع کے بعد اعتدال میں کھڑے ہوکر شوافع کے مسلک کے مطابق باقاعدہ قنوت ماثورہ بھی پڑھتے تھے، اس سے ہم لوگوں کو بڑا تعجب ہوا کہ مولانا (یوپی) کے رہنے والے، حنفی المسلک ہوکر فجر میں دعائے قنوت پڑھتے ہیں، بعض طلباء نے معلوم کیا تو فرمایا کہ یہاں کے رہنے والوں کی رعایت کرتا ہوں اور یہی ندوۃ العلماء کا مسلک ہے۔

کلکتہ اور ندوہ میں تدریس کی کل مدت

مولانا ازہریؒ کی کلکتہ اور ندوہ میں تدریس کی خالص مدت ستر (۷۰) سال پر محیط ہے، اس لئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان کی معنوی اولاد حد احصاء سے باہر ہے، ہندوپاک، بنگلہ دیش، سنگاپور، ملیشیا، تھائی لینڈ اور انڈونیشیا وغیرہ جیسے ملکوں میں ان کے طلبہ پھیلے ہوئے ہیں، مولانا ازہریؒ نے درس وتدریس کی خدمات انجام دیتے ہوئے عالمی مسابقۂ قرآن مکہ مکرمہ میں کئی بار بحیثیت حکم شرکت فرمائی، پہلی بار ۱۴۰۸ھ میں پھر بالترتیب ۱۴۱۱ھ/۱۴۱۲ھ/۱۴۱۳ھ میں شرکت فرماتے رہے، پھر سعودی سفارت خانہ دہلی کی جانب سے منعقدہ مسابقۂ قرآن وحدیث ۱۴۲۲ھ میں بحیثیت حکم وصدر شرکت فرمائی۔

باب سوم

مولانا کا طرز تدریس اوران کے شاگرد

تمہید

کسی بھی عظیم شخصیت یا عظیم استاذ ومربی کو سمجھنے کے لئے اس شخصیت سے مستفید ہونے والے یا اس شخصیت کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے والے اوراس سے خوشہ چینی کرنیوالے صحیح انداز میں بتلا سکتے ہیں کہ وہ اپنے فن میں کس درجہ کے اور کس مقام پر فائز تھے اوران کا طرز تدریس یا انداز تربیت کیا تھا، چنانچہ یہاں مولانا محبوب الرحمٰن صاحب ازہری کے بعض شاگردوں کے تأثرات ان کے درس وتدریس کے طرز سے متعلق تحریر کئے جاتے ہیں۔

طلبہ اوراساتذہ میں محبوبیت

مولانا کے شاگرد رشید مولانا واضح رشید حسنی ندوی ’’مولانا محبوب الرحمٰن صاحب ازہری کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

’’استاذگرامی حضرت مولانا محبوب الرحمٰن صاحب ازہری (سابق استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ومدرسہ عالیہ کلکتہ) گونا گوں خصوصیات اور انفرادی صفات کے حامل عالم ومعلم دین اورمشفق ومحبوب مربی تھے، ایسا بہت کم ہوا ہے کہ اسم اورمسمی میں پوری مطابقت اورمناسبت ہو، ہمارے مؤقر استاذ مولانا محبوب الرحمٰن ازہریؒ کی دیگر خصوصیات

وامتیازات کے ساتھ ایک خصوصیت طلبہ اوراساتذہ میں ان کی محبوبیت تھی۔

ان کی تعلیم کا ذریعہ منفرد تھا

آگے مولانا تحریر کرتے ہیں: ''ہمیں کئی سال ان سے استفادہ کی سعادت حاصل ہوئی بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ عربی تعلیم کی ابتدا ان کی شاگردی میں ہوئی، اور عربی ادب کی اعلی کتابیں بھی ان سے پڑھیں، دونوں مرحلوں میں ان کی تعلیم کا ذریعہ منفرد تھا، زبان سکھانے کا طریقہ الگ اور ادب کی کتابوں کی تعلیم کا طریقہ الگ، وہ ازہر سے فارغ ہوکر تشریف لائے تو ان کا عربی لہجہ اور طلبہ سے مخاطب ہونے کا انداز خود عربی زبان سے محبت اور اس میں کمال پیدا کرنے کا شوق پیدا کر دیتا تھا، زبان سیکھنے کے لئے تعلیم کا لہجہ اور طریقہ تعلیم بہت مؤثر ہوتا ہے۔

عربی زبان کا طریقہ تدریس

پھر مولانا واضح صاحب لکھتے ہیں: ''مولانا محبوب الرحمٰن ازہری مرحوم کو بغیر کتاب کے عربی زبان پڑھانے کا فن آتا تھا، اس وقت تک ان کی کتاب ''المحاورۃ العربیۃ'' چھپی نہیں تھی، وہ طلبہ کو براہ راست عربی پڑھاتے تھے، طلبہ کو مختلف اشیاء کے نام بتاتے، طلبہ سے سوال کرتے اور عربی میں جواب دینے پر اصرار کرتے تھے، اس طرح وہ عربی بولنے کی صلاحیت پیدا کرتے تھے، یہ عربی میڈیم کا طریقہ تھا، اگر یہ طریقہ مدارس عربیہ میں ابتدائی مرحلہ میں اختیار کیا جائے تو یہ شکایت دور ہوجائے کہ مدارس دینیہ میں طلبہ دس سال پڑھنے کے باوجود عربی بولنے بلکہ سمجھنے پر قادر نہیں ہوتے، وہ طلبہ کی صلاحیت کے اعتبار سے روزمرہ کے موضوعات پر مضمون لکھواتے اور طلبہ کے گروپ بنا کر ان کو عربی میں بولنے کی مشق کراتے تھے، ایسا لگتا تھا کہ جیسے ان کو خود لطف آرہا ہے، گویا عربی

پڑھانے اور سکھانے کی ان کی ہابی (Hobby) تھی، اسی لیے ان سے تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ میں عربی زبان سے محبت اور عربی بولنے میں لذت کا احساس پیدا ہوجاتا تھا، جس کا تجربہ خود ہم کو ہے، ہمارے ایک دوسرے موقر اور مشفق استاد مولانا عبدالحفیظ بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ جن کی ''مصباح اللغات'' سے بڑی شہرت ہوئی، فرماتے تھے کہ کامیاب استاد وہ ہے جو طلبہ میں اپنے موضوع سے مناسبت پیدا کردے، اس پر سب کا اتفاق ہے کہ زبان سے محبت زبان سیکھنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

مولانا معلم کے ساتھ مربی بھی تھے

مزید مولانا واضح صاحب لکھتے ہیں: ''مولانا محبوب الرحمٰن ازہری معلم کے ساتھ مربی بھی تھے، وہ زبان کے ساتھ عربی ثقافت اور اسلامی اخلاق کی تعلیم پر توجہ دیتے تھے اور زبان اور ادب کی تعلیم میں فرق کرتے تھے، جس کا لحاظ مدارس دینیہ میں عام طور پر نہیں ہے، طالب علم میں پہلے زبان یعنی روزمرہ کے استعمال کے الفاظ اور تخاطب کی صلاحیت پیدا کرانے کے وسائل اختیار کرنے چاہئیں، اس کے بعد ادب کی تعلیم میں لغات کے فروق، محل استعمال، حسن تعبیر، بلاغتی نکات اور اس کے بعد کے مرحلہ میں تنقیدی موازنہ کی طرف توجہ مبذول کرانی چاہئے، مولانا مختلف مراحل کے درس میں اس کا لحاظ رکھتے تھے، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نصاب میں اس کا لحاظ رکھا گیا ہے، اسی لیے عربی زبان وادب کی کتابوں بلکہ ان کے ابواب مرحلہ وار پڑھائے جاتے ہیں اور نصوص ادبیہ کی تعلیم میں طالب علم اور مرحلۂ تعلیم کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔

حضرت مولانا مرحوم کے درس کی خصوصیات

طارق احمد منہاس بانگ حراء میں مولانا مرحومؒ کے درس کی خصوصیات کو کچھ یوں

بیان کرتے ہیں: ''حضرت مولانا محبوب الرحمٰن ازہری صاحب کے درس میں نہ صرف احادیث شریف کی تشریح بیان کی جاتی تھی، بلکہ ان کے درس میں علوم عقلیہ، لغت وفلسفہ، منطق وبلاغت اور بدیع بھی شامل تھا، درس بخاری شریف کے ایام میں جب حضرت علامہ مرحوم بہت زیادہ علیل ہوگئے، تو ہم سب طلبہ ان کی عیادت کیلئے ان کے داماد مولانا ابوسحبان صاحب کے گھر گئے، تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ حضرت مولانا مرحوم اپنی بقیہ زندگی کا آخری سانس لے رہے ہیں؛ لیکن جب انہوں نے ہم طلبہ کو دیکھا تو بہت خوش ہوئے، اور ان کا منور چہرہ بشاشت سے جگمگانے لگا اور اپنی ہلکی اور محبت بھری آواز میں قریب بلایا،، عربی زبان میں گفتگو فرمائی اور فرمایا کہ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے تاکہ میں آپ کو پھر سے بخاری شریف کا درس دے سکوں اور آپ ادھورے نہ رہ جائیں''۔

مولانا مرحوم کے شاگرد رشید حضرت مولانا مفتی محمد ظہور ندویؒ اپنے مضمون ''چند یادیں چند باتیں'' بانگ حراء ازہری صفحہ ۲۹ر پر تحریر فرماتے ہیں:

''مجھے مولانا مرحوم سے انشاء پڑھنے کا موقع ملا، وہ انشاء میں معمولی کاٹ پیٹ کرتے یعنی ضروری اصلاح فرماتے تھے، اسی کا نتیجہ تھا کہ طلباء مولانا محبوب الرحمٰن صاحب سے بہت زیادہ مانوس تھے، یوں بھی اس زمانے میں جامعہ ازہر کے فارغین کی بڑی شہرت تھی، یہ ایسے ہی تھا جیسے ایک زمانہ میں ولایت پلٹ ایک بڑی سند تھی لیکن بعد میں کثرت کی وجہ سے وہ بات نہیں رہی، مولانا سے ان کے تعلیمی مجاہدات اور تعلیمی مشقیں سنیں، اس لئے ان سے اور بھی زیادہ تعلق ہوگیا تھا، مولانا مرحوم کے اسی سحر خیز تدریسی انداز کا نتیجہ تھا کہ آج دنیائے عالم میں آپکے ہونہار شاگردوں کی تعداد پھیلی ہوئی ہے۔

مولانا اپنے تلامذہ کی نگاہ میں

استاذ اور طالب علم کا تعلق بہت گہرا اور مضبوط ہوتا ہے، استاذ کے احسانات سے

طالب علم کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتا، اگرچہ استاذ کیسے ہی ہوں؛ لیکن اگر استاذ خلوص وللّٰہیت کا پیکر، حسن اخلاق وکردار کا سنگم اور علم کا بحر بیکراں ہوتو پھر طالب علم جس قدر اس کے چشمہ صافی سے سیراب ہوتا ہے اتنی ہی استاذ کی عظمت ومحبت اور عقیدت دل کی گہرائیوں میں سرایت کرتی چلی جاتی ہے، مولانا محبوب الرحمٰن ازہریؒ کو بھی اللہ تبارک وتعالی نے انہی خصوصیات وامتیازات سے نوازا تھا۔

ان کے تلمیذ رشید دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مؤقر استاذ جناب مولانا قیصر حسین ندوی مرحوم کی خوبیوں اور کمالات کا ذکر کرتے ہوئے انکی درسی خصوصیات کے بارے میں رقم طراز ہیں: ''راقم آثم نے مولانا سے نہج البلاغہ تخصص ادب میں پڑھی، مولانا کو عربی زبان وادب میں مکمل مہارت اور عبور حاصل تھا، آپ کا لہجہ عربوں جیسا تھا، اسلوب نہایت پرکشش تھا، آپؒ طلبہ کو نہایت خوش مزاجی اور بے تکلفی سے پڑھاتے تھے، میں نے انہیں کبھی غصہ ہوتے نہیں دیکھا، ہمیشہ ہنستے مسکراتے رہتے''۔

چونکہ مولانا جامع ازہر کے فارغ التحصیل تھے، وہ جملہ علوم عالیہ شرعیہ میں کامل دسترس رکھتے تھے، چنانچہ جب نامور محدث مولانا ضیاء الحسن صاحب کا انتقال ہوا تو حدیث کی اہم ترین کتاب بخاری شریف کا درس آپ کے ذمہ سونپا گیا، آپؒ نے اس مسند کے وقار کو اس خوبی سے نبھایا کہ زبان حال سے کہنا پڑا ؎

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

مولانا کے ایک شاگرد عزیز مولانا آفتاب عالم ندوی جنہیں مولانا سے بخاری پڑھنے کا شرف حاصل رہا، وہ مولانا کی درسی خصوصیات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''مولانا کا درس عام طور پر عربی میں اور کبھی کبھار اردو میں ہوتا، اردو میں نسبۃً مختصر جب کہ عربی میں تشریح وتفصیل زیادہ ہوتی''۔

مولانا ضیاء الحسن ندوی کی ١٩٨٩ء میں وفات کے بعد صحیح البخاری اور مولانا ابوالعرفان

ندوی کی ۱۹۸۸ء میں وفات کے بعد ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کے اسباق کی تکمیل فرمائی، چونکہ موصوف مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ اور جامع ازہر مصر کے قدیم جامع نصاب تعلیم کے فارغ التحصیل تھے، اس لئے وہ جملہ علوم وفنون میں درک رکھتے تھے اور ہر فن کی کتابیں پڑھانے پر قدرت رکھتے تھے۔

مولانا کو صحاح ستہ بشمول مسلسلات اور جملہ مرویات کی اجازت شیخ محمد یٰسین بن محمد عیسی الفادانی المکی سے اور شیخ فادانی کے استاذ محدث الحرمین شیخ عمر حمدان محرسیؒ سے حاصل تھی، اور تفسیر بیضاوی کی اجازت بھی شیخ فادانی سے حاصل تھی۔

مولانا کے مشہور تلامذہ پر اجمالی نظر

مولاناؒ کے شاگردوں کی تعداد بے شمار ہے، اس جگہ ہم مولانا مرحوم کے چند شہرہ آفاق تلامذہ کا تذکرہ کرتے ہیں جن کے علم کا ڈنکا آج چہاردانگ عالم میں بج رہا ہے، عجم ہی کیا دنیائے گیتی میں آپ کے شاگردوں کی نظیر پیش نہیں کی جاسکتی، ہم ان شہرہ آفاق تلامذہ میں سے چند کا ذکر کرتے ہیں جس سے قارئین کو مولانا کے مقام کا اندازہ ہوسکے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مولانا کے مشہور تلامذہ میں مولانا مفتی محمد ظہور صاحب ندویؒ سابق نائب ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مولانا سید واضح رشید ندوی سابق معتمد تعلیمات دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، ڈاکٹر سید سلمان ندوی ابن علامہ سید سلیمان ندویؒ، پروفیسر حبیب الحق ندویؒ، مولانا حبیب ریحان خان ندویؒ ثم ازہری، مولانا عبدالماجد ندوی (مؤلف معلم الانشاء اول، دوم) مولانا محمد مسلم ندوی وغیرہ ہیں، اسی طرح مدرسہ عالیہ کلکتہ میں آپ کے مشہور تلامذہ میں مولانا عین الباری، ڈاکٹر راحت اللہ ازہری (سابق صدر شعبہ عربی کلکتہ یونیورسٹی) پروفیسر محمد یحیی تمیزی (صدر شعبہ عربی گوہاٹی کالج آسام) شیخ عبدالمجید، پروفیسر محمد مظہر علی، مولانا شاہد روح اللہ رحمانی، ڈاکٹر محمد محسن عثمانی (ڈین انگلش اینڈ فارین لنگویج یونیورسٹی حیدرآباد) جیسے قابل قدر اسمائے گرامی ہیں۔

باب چھارم

دعوتی واصلاحی کوششیں اور باطل کے خلاف جدوجہد

تمہید

مولانا کا دینی فہم وادراک گہرا اور صلاحیت پختہ تھی، کتاب وسنت ان کے لئے چراغ راہ تھی، صدق واخلاص کی دولت اور اصلاح ودعوت کی تڑپ انہیں ورثہ میں ملی تھی، حکمت وموعظت اور موقع ومخاطب کی رعایت ان کے مزاج کا حصہ تھی، وہ نرمی وحلاوت کی تاثیر سے دل ودماغ کو مسخر کرنا خوب جانتے تھے، دین کے اصول ومبادی کی روشنی میں مشکل اور نازک ترین مسائل کو اس طرح حل کردیتے تھے کہ مخاطب مطمئن ہوجاتا تھا۔

مولانا کے اصلاحی اور دعوتی کاموں میں مزاج نبوت کا عکس

مولانا کے اصلاحی اور دعوتی کاموں میں ہمیں مزاجِ نبوت کا عکس نظر آتا ہے، آپ کی نگاہ میں انبیائی مشن کا پورا نقشۂ کار اور خصوصیت کے ساتھ خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ جلوہ گر تھا، سید ضیاء الحسن (جو مدرسہ جلیلہ کے ممبر ہیں جبکہ مولانا صدر) نے بعض ممبران کے بارے میں شکایت کی کہ دیگر کارکنان کارِ خیر میں تعاون نہیں کرتے بلکہ الٹا مخالفت کرتے ہیں، تو مولانا مسکرائے اور فرمایا:

''جب مخالفت اس درجہ بڑھ جائے کہ لوگ تمہیں گالیاں دینے لگیں اور مارنے لگیں،

تب سمجھو کے کام ہو رہا ہے، جاؤ خلوص کے ساتھ کام کرتے رہو اور تنگ دل مت ہو''۔

پھر موصوف ایک وقت کمیٹی سے ایسے دلبرداشتہ ہوئے کہ استعفیٰ لکھا اور مولانا کی خدمت میں پیش کر دیا، مولانا نے تحریر پڑھی متفکر ہوئے، پھر کفارِ مکہ کے مقابلے میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر ڈھائی جانے والی اذیتوں اور تکالیف کا ذکر کیا اور فرمایا:

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اللہ تعالیٰ سے نہ شکایت کی اور نہ کہا کہ لیجئے اللہ میاں میرا استعفیٰ، مجھے ایسی پیغمبری نہیں چاہئے! جس میں اس درجہ تکلیف اور پریشانیاں ہیں''۔

استعفیٰ پیش کرنے والے اس تفہیمِ لطیف سے لاجواب بھی ہوئے، مطمئن بھی، اور نئے عزائم کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں بطریقِ احسن نبھانے لگے۔

یہ تھا مولانا کے اصلاح وتربیت کا طرز جو یقیناً مشکوٰۃِ نبوت کا پرتو تھا، مولانا کی حکیمانہ تربیت پر آپ کی صاحبزادی محترمہ رفعت محبوب کی تحریر جو کتابی شکل میں بھی شائع ہوگئی ہے، بہت ہی نظر کشا ہے۔

ردقادیانیت مولانا کی زندگی کا سب سے بڑا مشن

مولانا مرحوم پیشہ کے لحاظ سے معلم تھے، زندگی بھر درس وتدریس سے تعلق رہا، لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ مولانا کے فکر وعمل بلکہ مولانا کی زندگی کا سب سے بڑا مشن ردقادیانیت ہے، آپ نے اپنی تمام تر توانائیاں اسی میں صرف کیں۔

مولانا ابتداء قادیانیت کو محض ایک فرقہ سمجھتے تھے، مصر میں قادیانیوں سے آپ کا پہلا تعارف ہوا، اس وقت قادیانیوں کے بارے میں آپ کا کیا تصور تھا، مولانا خود تحریر فرماتے ہیں:

سب سے پہلے مصر پہنچ کر کلیۃ اصول الدین میں دو احمدی قادیانی داخل ہونا چاہتے تھے، تو اندازہ ہوا کہ یہ کوئی فرقہ ہے، جو ناپسندیدہ ہے، شیخ الکلیہ نے داخلہ سے انکار

کر دیا، بلکہ ازہر کے کسی شعبہ میں داخلہ کی مخالفت کی اور ان دونوں نے توبہ کا اعلان شائع کیا، تب بھی کلیۃ اصول الدین میں داخل نہیں ہو سکے، یہ میرا ابتدائی تعارف تھا، ہندوستان واپس آکر ذہن میں کچھ بھی باقی نہ تھا، صرف یہ تصور کہ دوسرے فرقوں (چشتی، قادری، مجددی وغیرہ) کی طرح یہ بھی کوئی فرقہ ہے۔

یہاں تک کہ کلکتہ پہنچنے کے بعد بھی مولانا کا یہی تصور رہا، اوران سے مناظرہ کو غیر ضروری سمجھتے رہے، مولانا کے الفاظ میں:

کلکتہ پہنچ کر ۱۹۶۰ء کے بعد معلوم ہوا کہ قادیانیوں اور مسلمانوں میں مناظرہ ہوا ہے، جس کو غیر ضروری سمجھ کر میں اس سے الگ رہا، حالانکہ میرے ساتھی علماء اس میں شریک ہوتے رہے، لیکن مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

کلکتہ کے مناظرے میں آپ نے شرکت نہیں کی اور خود فرمایا کہ ''مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں رہی''، مگر یہی واقعہ قادیانیت سے دلچسپی کا ذریعہ بنا، ہوا یوں کہ اس مناظرے کے لئے مشہور مناظر مولانا لعل حسین اختر کو بلایا گیا، ان کا قیام آپ کی بلڈنگ میں تھا، جس کے نتیجہ میں تقریب بہر ملاقات کی صورت پیدا ہوئی، یہیں آپ نے مرزا صاحب کی کتابیں دیکھیں اور اس کی حقیقت سے واقف ہوئے، جس کے نتیجہ میں یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ ان کی تعلیمات دین اسلام کے اصول کے خلاف ہیں۔

قادیانیت کی طرف توجہ کا دوسرا محرک مولوی عبدالحنان عبقری نامی شخص سے ملاقات ہے، مولانا شروع میں ان کی باتوں سے بہت متاثر ہوئے، یہاں تک کہ بقول مولانا ''اس سے مرید ہونے کے لئے سوچنے لگا''، لیکن جب اس کا اصل روپ سامنے آیا اور اس نے مرزا صاحب کے فضائل وکارنامے گنوائے تو پھر آپ کے کان کھڑے ہوئے، اس کے بعد آپ نے گویا قادیانیوں کے لئے خود کو وقف کر دیا، اوراس میدان میں آپ نے بڑی سرفروشانہ خدمات انجام دیں، اللہ کے فضل وکرم سے آپ کی محنت رنگ لائی اور

آپ کو اپنے مقصد میں کامیابی ملی۔

مولانا کی ان سرگرمیوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے آپ کے ابتدائی دور کے شاگرد مفتی محمد ظہور ندوی (سابق نائب ناظم ندوۃ العلماء) تحریر فرماتے ہیں:

مولانا کا قیام کلکتہ میں صرف نوکری پیشہ کا قیام نہیں تھا، بلکہ وہ ایک دردمند داعی کی حیثیت سے رہے، ردقادیانیت کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور عملاً اس فتنہ کے سدباب کے لئے تیار ہوگئے، کلکتہ کے آس پاس کے حلقوں میں خوب دورہ کیا اور قادیانیت کی مخفی خباثت کو ایسا اجاگر کیا کہ عوام کو قادیانیت سے گھن آنے لگی، اور قادیانیت کے داعی ان حلقوں میں جانے سے شرمانے لگے، بالآخر وہاں سے اپنا بوریہ بستر اٹھا کر بھاگ نکلے۔

مولانا محمد علاء الدین ندوی (وکیل کلیۃ اللغۃ دارالعلوم ندوۃ العلماء) اپنے ادیبانہ انداز میں مولانا کو یوں خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

دعوت وتبلیغ کا خاص مزاج پایا تھا، اس مزاج نے آپ کو ردقادیانیت کے لئے میدان عمل میں لا کھڑا کیا، مولانا مدرسہ عالیہ کلکتہ میں سرکاری ملازم تھے، اسی زمانہ میں قادیانیت کے لئے شمشیر براں بن کر کھڑے رہے، اور ان کی گردن پر ایسی ضرب کاری لگائی کہ پھر وہ مضافات کلکتہ میں جاں بر نہ ہوسکی۔

مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی (استاد حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء) قادیانیت سے متعلق آپ کی سرگرمیوں کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فرق ضالہ پر مولانا کی گہری نظر تھی، ردقادیانیت ان کی زندگی کا مشن تھا، قادیانیوں کو حج بیت اللہ سے روکنے میں موصوف نے اہم رول ادا کیا ہے اور اس سلسلہ میں شاہ فیصل مرحوم سے مراسلت بھی کی تھی، مولانا کے دستاویز میں شاہ فیصل کے نام آپ کا مکتوب محفوظ ہے''۔

فرق ضالہ کی تردیداوردفاع اسلام مولانا کا میدان تھا

فرقِ ضالہ کی تردیداوردفاع اسلام کے میدان میں مولانا کا قلم تیغِ سپاہ تھا،اس میدان میں آپ نے غیورمجاہداورنڈرسپاہی کا کرداراداکیا،اس کے لئے آپ نے اوریجنل مآخذ کا عمیق ودقیق مطالعہ کیا،اسفارومناظرے کئے،مضامین ومقالات لکھے،عوام وخواص اور علماءوطلباءکومخاطب کیااورطلبہ کوفتنۂ قادیانیت کے مقابلے میں ہراول دستہ بنانے کی کوشش کی،مولانانے قادیانیت کے اصل سرچشمہ مرزاجی کی تصنیفات اوران کے دعوؤں سے لبریز کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔

قادیانیت کی حماقت کم مائیگی اور بے عقلی

چنانچہ محمد شفیع اللہ امیراحمدیہ جماعت بنگلور کے نام اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:
’’میں نے قادیانیت کا مطالعہ براہِ راست مرزاکی کتابوں سے کیا ہے،اسی لئے مرزاجی ہی کے حوالے سے عرض کررہاہوں‘‘۔

پھرمولانانے عبارتوں کی عبارتیں نقل فرماکراس مذہب کے بودے پن کی قلعی کھولی، اس باطل فرقہ کی تردید کےسلسلہ میں آپ کے موقف کی وضاحت ایک ندوی فاضل ان الفاظ میں کرتے ہیں:

’’مولانا مرحوم کے خطابات اورتحریروں کو پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ قادیانیت کی علمی تردید کے بجائے اس کی حماقت،کم مائیگی اور بے عقلی کواس انداز سے بتایا گیاہے کہ وہ اتنی اہمیت کی چیز نہیں ہے کہ باقاعدہ اس کی تردید میں دماغی صلاحیتیں صرف کی جائیں اوراس لائق ہی نہیں کہ حماقت اور بے عقلی کےسواکسی اورترازو میں تولا جائے‘‘۔

جسمانی اور قلمی جہاد

مولانا محمد علاء الدین ندوی رقم طراز ہیں: ''مبارک ہے علماء کرام کی وہ بابرکت جماعت جس نے فتنۂ قادیانیت کی گہری سازشوں کی قلعی کھولی، جس نے مرزا کے گندے افکار کی بخیہ ادھیڑی اور قادیانیت کی فتنہ سامانیوں کے خلاف علمِ جہاد بلند کر کے امت مسلمہ کو اس فتنہ کی زہرناکیوں سے بچالیا، اس مبارک جماعت کی سنہری لڑی میں ہزاروں موتی جھلملاتے ہیں اور اس میں مولانا محبوب الرحمٰن یقینی طور پر شامل ہیں، کیونکہ جھوٹے نبیوں کے سب سے بڑے جھوٹے سردار کے ارتدادی عزائم پر آپ نے زوردار تیشے چلائے اور عقیدہ ختمِ نبوت کو تحفظ فراہم کرنے میں جسمانی اور قلمی جہاد کیا''۔

قادیانیت کا راست مطالعہ

مولانا کی حیثیت ایک دردمند داعی کی تھی، جنہوں نے ردقادیانیت کو اپنا مشن بنایا تھا، ایک سچے داعی کے لئے ضروری ہے کہ جس چیز کی دعوت دے رہا ہو اس سے پوری طرح واقف ہو، اور یہ مطالعہ براہ راست ہو، بلاواسطہ ہو، بالواسطہ نہیں، بالفاظ دیگر معلومات اوریجنل ہونی چاہیے، سیکنڈ ہینڈ نہیں، تحقیق کا صحیح منہج بھی یہی ہے، ہمیں مولانا کے یہاں یہ چیز پوری طرح نظر آتی ہے اور کیوں نہ ہو کہ جنہوں نے جامع ازہر جیسی دانشگاہ سے اکتساب فیض کیا، ان کو صحیح منہج ہی اختیار کرنا چاہیے، چنانچہ اس سلسلہ میں آپ کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ قادیانیت سے متعلق آپ کی واقفیت بلاواسطہ تھی، آپ نے باضابطہ مرزا صاحب کی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا، پہلی مرتبہ آپ کو ان کی کتابیں مشہور مناظر مولانا لعل حسین اختر کے پاس ملیں، جس کا ذکر مولانا نے خود کیا ہے، اس کے بعد بھی مولانا قادیانیت سے متعلق لٹریچر کا مطالعہ کرتے رہے، نتیجتاً آپ اس موضوع

پر اتنے حاوی ہوگئے کہ خود کو مرزا کے مدمقابل سمجھنے لگے، سفر قادیان میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''ان حالات کا اثر یہ ہوا کہ مجھے قادیانیوں کی اصل کتابیں ملنے لگیں، اور ''بدر'' کا پرچہ بھی اکثر مجھ تک پہنچنے لگا، جس سے میری معلومات میں کافی اضافہ ہوا، اور میں مرزا کا مستقل مدمقابل بن گیا''۔

قادیانیوں سے مناظرہ کے دوران آپ ہمیشہ مرزا صاحب کی اصل کتابوں کی عبارتیں پیش کرتے، سفر قادیان میں آپ نے چند مناظروں کی تفصیل قلمبند کی ہے، وہاں ہمیں مرزا صاحب کی متعدد کتابوں کی عبارتیں ملتی ہیں، اسی طرح امیر جماعت احمدیہ کرناٹک جناب محمد شفیع اللہ صاحب کے نام آپ نے ایک اہم خط تحریر فرمایا تھا، اس خط میں مرزا صاحب کی جن کتابوں کی عبارتیں پیش کی ہیں، بطور مثال ان کے نام درج کئے جاتے ہیں: مواہب الرحمٰن، سیرت المہدی، تذکرہ، حمامۃ البشری، حیات ناصر وغیرہ، ان کتابوں سے عبارتیں پیش کرنے کے بعد آپ نے ایک جگہ یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ ''اگر آپ ضرورت سمجھیں تو مجھ سے فوٹو اسٹیٹ منگوا سکتے ہیں'' جس سے یہ بات مزید پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ مرزا صاحب کی یہ کتابیں آپ کے پاس موجود بھی تھیں۔

قادیانیت سے متعلق مولانا کی کوششوں پر ایک نظر

مولانا نے قادیانیت کی رد کے لئے تمام وسائل کو اختیار کیا، قادیانیوں سے مناظرے کئے، اس سلسلہ میں کلکتہ واطراف کے دعوتی دورے کئے، مضامین اور مقالات لکھے، ان کو حج سے روکنے کے لئے اپنی تمام توانائی صرف کردی، علماء کو اس عظیم فتنہ سے آگاہ کیا، قادیانیوں سے مقابلہ کی تیاری کے لئے علماء کو تربیت دی، اور سب سے بڑھ کر یہ آپ کے ذریعہ ہی اس فتنہ کی حقیقت شاہ فیصل تک پہنچی، الغرض یہ موضوع آپ کے ذہن اور فکر میں

ایسا رچ بس گیا تھا کہ بقول ایک ندوی فاضل ”نشست وبرخاست اور عام مجلس بھی مولانا کے اس جذبہ اور فکر سے خالی نہیں ہوتی تھی، جس میں مولانا نے اسلام کے دفاع اور فرق ضالہ کی تردید پر گفتگو نہ کی ہو“۔

مولانا کا یہ جذبہ جو دراصل ان کی دلسوزی اور فکرمندی کا غماز تھا، صرف شنیدہ نہ تھا، مولانا کے رفقاء، دارالعلوم کے اساتذہ جنہیں آپ کی صحبت میسر آئی، سب اس کے گواہ ہیں، اخیر عمر میں ضعف کے باوجود جب دارالعلوم تشریف لاتے تو دارالقضاء بھی آتے کہ آپ ایک زمانہ میں اس شعبہ کے فعال کارکن رہ چکے تھے، دارالقضاء میں اگر مولانا مفتی محمد ظہور ندوی صاحب نہیں ہوتے تو ہم کارکنان کو مستفید فرماتے، ان مجلسوں میں راقم کو بار بار آپ کے اس جذبہ کو قریب سے دیکھنے اور محسوس کرنے کا موقعہ ملا۔

قادیانیت سے متعلق مولانا کی سرگرمیاں

مولانا نے قادیانیت سے متعلق اپنی جن سرگرمیوں کا تذکرہ کیا ہے ان میں سب سے پہلی چیز قادیانیوں سے مباحثہ ہے، جب آپ کلکتہ میں مقیم تھے، اس زمانہ میں وہاں قادیانی مبلغین بہت سرگرم تھے، اور بہت سے سادہ لوح مسلمان ان کے فریب میں آرہے تھے، یہ حالت وہاں کے علماء کے لئے تشویشناک تھی، چنانچہ علماء نے ان مبلغین سے مناظرے کرنے شروع کئے کہ اگر ان مبلغین کو شکست دے دی جائے تو قادیانیت کا دروازہ بند ہوجائے گا۔

مناظرین کی اس صف میں آپ نمایاں تھے، آپ نے بہت سے مناظرے کئے، مباحثوں کا سلسلہ کلکتہ سے لکھنؤ تک جاری رہا، سفر قادیان میں آپ نے جن مناظروں کا ذکر کیا ان میں سب سے پہلا مناظرہ ایک بنگالی عالم مولوی عبدالحنان عبقری سے ہوا، جب آپ کو معلوم ہوا کہ انہوں نے قادیانیت قبول کرلی ہے تو تحقیق حال کے لئے خود ان

کے پاس پہونچے، انہوں نے مرزا صاحب کے فضائل اور کارنامے بتائے، ان سب کے جواب میں مولانا نے بڑی ایمان افروز بات کہی، آپ نے کہا ''اگر مرزا جی مومن ہیں تو ان کے ہزاروں گناہ معاف ہیں، اور اگر ایمان نہیں تو تمام فضائل خاک میں، اور وہ ذرہ برابر فضیلت کے مستحق نہیں''اس کے بعد ان سے مرزا کے ایمان اور عدم ایمان کے بارے میں مباحثہ ہوا۔

اس کے علاوہ قادیانیوں کے متعدد مباحثوں کا تذکرہ کیا ہے، جن میں لکھنؤ کے مباحثے بھی شامل ہیں۔

اس سلسلہ میں آپ کی دوسری اہم کوشش جسے آپ کا کارنامہ کہا جانا زیادہ مناسب ہے، وہ یہ ہے کہ آپ نے ان قادیانیوں کے حج بیت اللہ سے روکنے کی کامیاب کوششیں کیں، اس کی داستان طویل ہے، مگر اس سے آپ کی لگن، حوصلہ اور داعیانہ شان کا اندازہ ہوتا ہے، مختصر یہ کہ آپ نے قادیانیوں سے مباحثہ کے دوران اس بات کو بار بار واضح کیا کہ مرزا نے اسلام کی بنیادی عبادات نماز، روزہ، زکوۃ اور حج پر کبھی عمل نہیں کیا، حج کے بارے میں تو آپ نے چیلنج کے طور پر کہا کہ ''مرزا جی کے پاس کافی مال و دولت تھا، اور استطاعت بھی، پھر وہ حج کو نہیں گئے، یہ ایک چیلنج تھا، جس کا میں اعلان کرتا ہوں''۔

اس چیلنج کا نتیجہ یہ ہوا کہ قادیانیوں کی ایک جماعت نے حج کا ارادہ کرلیا، اور بڑی حد تک کاروائیاں بھی کروالیں، جب آپ کو اس کی خبر ملی تو آپ نے ان کو روکنے کی کوشش شروع کی، اس کے لئے بمبئی کا سفر کیا، وہاں کی جمعیات کے ذمہ داران سے ملے، سعوی سفارت خانہ کے ذمہ داروں سے گفت وشنید کی، انہیں قادیانیوں کی حقیقت سے واقف کرایا، اس طرح آپ ہر ممکن کوشش کرتے رہے، بالآخر آپ کو کامیابی ملی، اور ''شاہ فیصل کے خط پر فوراً ایکشن لیا گیا اور حکم ہوا کہ قادیانیوں کو روکا جائے اور اگر جدہ پہنچیں تو جدہ کے ایرپورٹ پر گرفتار کئے جائیں''۔

اسی طرح کی کوشش ۱۹۶۷ء میں بھی کرنی پڑی جب دوبارہ آٹھ قادیانیوں نے حج کا ارادہ کیا، اس سفر میں بھی مولانا اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے، اس مرتبہ آپ کو سعودی سفارت خانہ کے ایک آفیسر شاذلی سے قادیانیت کے بارے میں تفصیلی گفتگو کرنے کا موقع ملا، آپ نے بڑے اچھے انداز میں ان کو قائل کیا، اس سلسلہ میں جو گفتگو ہوئی وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

قادیانیت سے متعلق آپ کی تیسری کوشش مسلمانوں کے قبرستان میں قادیانیوں کی تدفین پر پابندی سے متعلق ہے، اس کوشش میں بھی آپ وہاں کے ملی قائدین کے ساتھ رہے، اس کے لئے انجمن فلاح مساجد مغربی بنگال کا قیام عمل میں آیا، ایک دستخطی مہم بھی چلائی گئی، اور مختلف مرحلوں سے گزر کر اس میں بھی کامیابی ملی، اور حکومت نے مسلمانوں کے حق میں فیصلہ دیا، اس کوشش میں مختلف مقامات پر آپ نے مسلمانوں کی نمائندگی کی، اور اپنے ناخن تدبیر سے معاملہ کو سلجھایا، سی آئی ڈی سے گفتگو اور وزیر اعلی سے گفتگو کا انداز بڑا دلچسپ ہے ''قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند'' کے عنوان سے پہلے واقعہ کی روداد اس طرح بیان کرتے ہیں:

......اور پھر ظاہر ہے کہ حکومت کی مشینری بھی حرکت میں آ گئی یا لائی گئی، تلاش شروع ہوئی اور ''قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند'' سی آئی ڈی کے دو آفیسر میرے پاس آئے، اور اپنے تعارف کے بعد اس دستخطی تحریک کے بارے میں سوال کیا، میں نے پہلے ان کو رابطہ عالم اسلامی کی قرارداد اور اس میں پاکستان کا حصہ اور اسلامی بلاک کا مقام اور شاہ فیصل کے تعزیتی جلسہ کا حوالہ دے کر ان کو بتلایا کہ فلاں قادیانی قریب المرگ ہے، اس کے مرنے پر اس کا جنازہ قبرستان جائے گا تو وہاں فساد کا خطرہ ہے، اور اسی خطرہ سے بچنے کے لئے یہ شکل ہے کہ حکومت پہلے ہی مسلم قبرستانوں میں ان کا دفن منع کر دے، ورنہ نقض امن کی شکل میں آپ بھی پریشان ہوں گے، اور ہم بھی، ہم قوم کو بچانے کی کوشش

کریں گے اور آپ رپورٹ تیار کرنے کی فکر میں ہوں گے، اس لئے یہ اقدام بروقت ہے، اس گفتگو سے وہ مطمئن ہوگئے۔

سفر قادیان ایک تجزیاتی مطالعہ

مولانا مرحوم نے قادیانیت سے متعلق اپنی سرگرمیوں کی مختصر روداد اور اس فتنہ سے متعلق اپنی معلومات سینہ سے سفینہ میں منتقل کرنے کے لئے ماضی کے ان واقعات ومعلومات کو کاغذی پیرہن میں منتقل کرنا شروع کیا، جو ۱۰ ر نومبر ۱۹۹۳ء سے ۱۰ ر اپریل ۱۹۹۴ء تک قسطوار پندرہ روزہ تعمیر حیات لکھنؤ میں شائع ہوا، یہی مضامین کتابی شکل میں ''سفر قادیان'' کے نام سے ۲۰۰۱ء میں ندوۃ العلماء کے شعبہ دعوت وارشاد کی طرف سے شائع ہوئے۔

۸۵ ر صفحات کا مختصر رسالہ بڑے چشم کشا حقائق پر مشتمل ہے، ربع صدی سے زیادہ کی تاریخ کو مولانا نے گویا ''دریا بکوزہ'' کی شکل میں پیش کردیا ہے، کتاب کے مشتملات پر کچھ عرض کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اہل علم ودانش اس کتاب کو کس نظر سے دیکھتے ہیں:

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم اس کتاب کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

زیرِ نظر کتاب مولانا محبوب الرحمٰن صاحب ازہری زیدت مکارمہ نے تیار کی ہے، انہوں نے قادیانی ذمہ داروں کے احوال واعمال کا گہرا مطالعہ کیا اور جائزہ لیا، اس کے بعد جو حقائق سامنے آئے وہ انہوں نے ایک کتاب کی شکل میں جمع کئے، اور اسی فرقہ کے امام غلام احمد کی ان حرکتوں کا انکشاف کیا ہے، جس سے ان کا اسلام کے بنیادی اور لازمی احکام کے خلاف ہونا ثابت ہوتا ہے، مولانا کی اس کتاب سے غلام احمد قادیانی کے خلفاء

اور متبعین کے بارے میں ایسی ایسی باتیں خلاف اسلام پائی جاتی ہیں جن کی ایک عام مسلمان سے بھی توقع نہیں کی جاتی ہے۔

ایک ندوی فاضل اپنے البیلے اسلوب میں یوں رقمطراز ہیں: اسی طرح ''سفر قادیان'' جوان کے داعیانہ دلسوزی اور تب وتاب جاودانہ کا عمدہ نمونہ ہے، اپنے موضوع پر مختصر اور قادیانیت کی اسلام دشمنی کے تعارف میں جامع کتاب ہے۔

مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی اس کتاب کے بارے میں اپنا تاثر اس طرح نقل کرتے ہیں: اس رسالہ میں مولانا نے قادیانیت کے تار و پود بکھیر دئے ہیں، مؤلف نے طرز نگارش بڑا دلکش اپنایا ہے، جو نہایت مؤثر اور ایمان افروز ہے۔

واقعی یہ کتاب بقامت کہتر بقیمت بہتر'' کا بہترین مصداق ہے، اس میں قادیانیت سے متعلق حقائق بھی ہیں اور ان پر ضرب کاری بھی، مولانا کی دعوتی روئیداد بھی ہے اور آپ بیتی بھی، اس میں علمی اور ادبی دونوں طرز نگارش کے نمونے ملتے ہیں، مباحثوں کے انداز سے کتاب مزید دلچسپ ہوگئی ہے، راقم کی نظر میں اس کتاب کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

داعیانہ صفات

کتاب میں مولانا نے اپنی دعوتی سرگرمیوں کو اختصار سے بیان کیا ہے، اور زیادہ تر اسی حصہ کو نقل کیا ہے جس میں دوسروں کے لئے عبرت ہے، ان سرگرمیوں سے آپ کی داعیانہ صفات، دفاع عن الاسلام کے تئیں آپ کا جذبہ جاوداں اور لگن کا اندازہ ہوتا ہے، اس راہ میں آپ نے جن مشکلات ومسائل کا سامنا کیا اور آپ کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی، یہ اسی دعوتی مزاج کا حصہ ہے۔

قادیانیوں کو حج سے روکنے کے لئے مولانا نے کتنی مشقتیں برداشت کیں، اس کا ہلکا سا اندازہ گذشتہ سطور میں ہوا ہوگا، ایک مرتبہ مولانا کا ہرنیہ کا آپریشن ہوا تھا؛ لیکن اس کے باوجود

جلسوں میں شریک ہوتے تھے،اس سے آپ کے دھن اور تڑپ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔
دعوت کا ایک اصول صلہ وستائش کی تمنا سے بے پرواہ ہونا ہے کہ داعی کا اجر تو اللہ کے نزدیک ہے،اسے بندوں سے اپنے کام کی اجرت اور داد وتحسین کی طلب سے منع کیا گیا ہے،مولانا کی زندگی میں متعدد مقامات پرہمیں اس کی جھلکیاں ملتی ہیں،قادیانیوں کو حج سے روکوانے کے سلسلہ میں سفارت خانہ کا بار بار چکر لگانا پڑا،ایک مرتبہ آپ سے پوچھا گیا کہ آخر آپ کا مقصد کیا ہے،مولانا نے اس کا بڑا مومنامہ جواب دیا،اس جواب کونقل کئے بغیر آگے بڑھنا مشکل ہے، پورا واقعہ مولانا کے الفاظ میں:''میں اٹھنے لگا تو انہوں نے کہا ایک بات اور بتادیجئے ، مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ اس سے قبل بھی اسی سلسلہ میں آئے تھے،آپ کا مقصد کیا ہے؟ یا آپ کیا چاہتے ہیں؟اس کے جواب میں قرآن کی دوآیتوں کے ٹکرے ہیں، پہلا"وان الشیاطین لیوحون الی اولیاھھم لیجادلوکم وان اطعتموھم انکم مشرکون'' خطاب ابتدائی طور پرصحابہ سے ہے،اگران کوکہا جائے"انکم لمشرکون" بالتاکید تو پھر ہمہ شما کہاں؟اس نے تصدیق کی،اس کے بعد دوسری آیت"یاایھا الذین آمنوا انماالمشرکون نجس فلایقربوا المسجد الحرام بعدعامھم ھذا" خطاب کسی بادشاہ کونہیں،کسی زعیم کونہیں، بلکہ الذین آمنوا کو ہے، میں سمجھتا ہوں کہ میں الذین آمنوا میں ہوں،تو خطاب مجھ کو ہے،اور اسی کے حکم کے امتثال میں اپنی آخری حد کوپہنچ چکا ہوں،آگے آپ کواختیار ہے،اللہ تعالی قیامت کے دن مجھ سے اس آیت کے بارے میں سوال نہ کریں گے تونے کیا کیا؟ اس شخص پرلرزہ سا طاری ہوگیا،اور کچھ توقف کے بعد اس نے کہا بے شک قیامت کے دن گواہی دینا ہوگی کہ آپ نے پورا عمل کیا،اب ہمارے لئے دعا کیجئے کہ ہمیں بھی توفیق ہو کہ عمل کریں، میں نے کہا دعا اور جوکچھ ہوسکے گا ضرور کروں گا''۔

قادیانیت پر کام کرنے کا صحیح طریقہ

مولانا مرحوم نے قادیانیت کا اصل لٹریچر پڑھا تھا، پھر عمر عزیز کا بڑا حصہ قادیانیوں سے مباحثہ اوراس کی تردید میں گزارا، چنانچہ آپ کو خوب معلوم تھا کہ ان فتنہ پروروں سے کن موضوعات پر بات کی جائے، آپ کا خیال تھا کہ ان سے علمی اور منطقی دلائل کے بجائے ان کی علمی کم مائیگی واضح کردی جائے، اور یہ بتایا جائے کہ ان کے دعوے کتنے بے بنیاد ہیں، اسی طرح مولانا کی خواہش تھی کہ مباحثوں کے بجائے عوامی بیداری پیدا کی جائے، لوگوں کواس فتنہ سے آگاہ کیا جائے، نیز ہر علاقہ میں ایسے افراد تیار کئے جائیں جو ہر وقت جواب کے لئے تیار رہیں، مولانا تحریر فرماتے ہیں:

ایسے ہی ایک جلسہ میں شرکت کی اور جلسہ سے قبل مقامی مدرسوں وغیرہ کو متوجہ کیا کہ اس قسم کے جلسوں سے فائدہ کم ہوتا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ مقامی لوگ قادیانیت سے واقفیت حاصل کریں، اور ہر وقت جواب دینے کے لئے تیار رہیں، کلکتہ میں اس سے قبل بھی مولانا لعل حسین اختر کو بلایا گیا تھا، اوران کے دومہینہ کے قیام کے دوران قادیانی مبلغین حضرات کلکتہ کے باہر چلے گئے اور کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوسکا، اس کے بعد قادیانی پھر سرگرم ہوگئے اور عوام میں شکوک وشبہات کی بھرمار کردی۔

قادیانیت سے متعلق چند اہم حقائق

گو یہ کتاب زیادہ تر مولانا کی دعوتی روئیداد اور مباحثوں پر مشتمل ہے، مگر اسی درمیان مولانا نے قادیانیت سے متعلق اپنے وسیع مطالعہ کا نچوڑ بھی پیش کردیا ہے، یہ بڑے چشم کشا حقائق ہیں، جس سے عموماً لوگ ناواقف ہوتے ہیں، چند باتیں بطور نمونہ ذکر کی جاتی ہیں:

☆ مولانا نے تاریخ کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ قادیانیت اور یہودیت میں بڑا گہرا

رشتہ ہے، ورنہ یہودیوں کے اسکول میں قادیانیت کی تبلیغ چہ معنی دارد؟ آپ نے اس ثبوت میں مرزاجی کی کتابوں کی عبارتیں پیش کی ہیں۔

☆ پاکستان کی تقسیم مسلمانوں کے لئے المناک واقعہ ہے، یہ واقعہ اوراس کے اسباب بھی معروف ہیں، مولانا نے اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ پاکستان کو توڑنے میں قادیانیوں کا بڑا کردار رہا ہے، آپ نے اس کے ثبوت میں بہت سی عبارتیں پیش کیں ہیں، نیز اس وقت پاکستان میں سرگرم قادیانیوں کا جائزہ بھی لیا ہے، یہاں کتاب کا ایک پیراگراف نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، مولانا ''پاکستان کو توڑنے میں قادیانی کردار'' کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں:

انہوں نے (الفرقان کا اداریہ) پاکستان کو توڑنے میں قادیانی کردار بتایا (اور یہ بات راقم سطور کو بطور خود بھی معلوم تھی) کہ مشرقی پاکستان کو آبادی میں واضح اکثریت حاصل تھی، قادیانی اثرات سے بالکل پاک تھا، قادیانیت جو کچھ ہے صرف ہمارے مغربی پاکستان میں ہے، قادیانی قیادت نے سمجھا اور صحیح سمجھا کہ مغربی اور مشرقی پاکستان جب تک ایک ملک رہیں گے ہم کو ملکی سیاست وحکومت پر غلبہ اور شاہ گری کا مقام حاصل نہیں ہوسکتا، اس لئے انہوں نے اب سے بہت پہلے یہ پلان بنایا کہ مشرقی پاکستان کو کسی طرح الگ کیا جائے، اس کیلئے یہ راستہ اختیار کیا گیا کہ سیاسی اور اقتصادی معاملات میں مشرقی پاکستان کے ساتھ مسلسل ناانصافی کی گئی، جس نے بنگالی لیڈروں کو مجبور کردیا کہ وہ اندرونی خودمختاری کا مطالبہ کریں، اوراس کے بغیر مطمئن نہ ہوں۔

☆ مولانا نے قدرے تفصیل سے دکھایا ہے کہ قادیانیوں نے کس طرح پاکستان میں قادیان اسٹیٹ کا منصوبہ بنایا، اورکس طرح اسٹیٹ دراسٹیٹ کی شکل میں اپنے منصوبہ کو پایہ تکمیل تک پہنچایا، اس ضمن میں ''ربوۃ'' کی تاریخی حیثیت اور وہاں کی سرگرمیوں کا جائزہ پیش کیا ہے، اوراپنی بات کو تاریخی حوالوں اور دیگر مصنّفین کی عبارتوں سے مدلل کیا ہے۔

قادیانیت سے متعلق رابطہ عالم اسلامی کے موقف کے بعد پاکستان میں قادیانیوں کو ''غیر مسلم اقلیت'' کا درجہ دیا گیا، اس کی تفصیل بھی مولانا نے اس کتاب میں بیان کی ہے، ان کے علاوہ اور بھی بہت سی اہم باتیں اس میں زیر بحث آئی ہیں، جن کے ذکر یا تبصرہ سے طوالت مانع ہے۔

مولانا کی کوششوں کے اثرات

مولانا مرحوم کی کوششوں کا سب سے پہلا فائدہ یہ ہوا کہ کلکتہ میں قادیانی فتنہ کا سیلاب تھما، اور بقول مفتی محمد ظہور ندوی صاحب ''قادیانیت کے داعی ان علاقوں میں جانے سے شرمانے لگے اور بالآخر وہاں سے اپنا بوریہ بستر اٹھا کر بھاگ نکلے''۔

دوسرا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ انہی کوششوں کی نتیجہ میں بات شاہ فیصل تک پہنچی، ان کی کاروائی سے قادیانیوں کا حج کے لئے سعودی میں داخلہ بند ہونا ایک وقتی فائدہ تھا، میرے خیال میں اس کا سب سے اہم فائدہ یہ ہوا کہ اس کے ذریعہ شاہ فیصل قادیانیت کی اصل حقیقت سے واقف ہو گئے، پھر یہ موضوع رابطہ عالم اسلامی میں پیش ہوا، اور اس نے قادیانیت کے بارے میں تاریخی فیصلہ کیا، ممکن ہے کہ دوسرے علماء نے بھی شاہ کو یا رابطہ کو اس فتنہ سے آگاہ کیا ہو، یا اس موضوع پر توجہ کے دوسرے اسباب بھی ہوں، مگر ان سب کے ساتھ مولانا مرحوم کی کوشش یعنی شاہ فیصل کے نام مکتوب کو ہمیشہ اس سلسلہ میں یاد رکھا جائے گا، واضح رہے کہ شاہ کے نام خط مولانا نے ۱۹۶۵ء میں لکھا تھا اور رابطہ کا فیصلہ ۱۰/اپریل ۱۹۷۴ء کو سامنے آیا، اس سے بھی مولانا کی کوشش کا مقدم ہونا ثابت ہوتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے مولانا کی خواہش تھی کہ ہر علاقہ کے علماء قادیانیت سے واقفیت

حاصل کریں، اور عام مسلمانوں کو اس سلسلہ میں بیدار کیا جائے، تاکہ وہ قادیانیت کے دام فریب میں نہ آئیں، بعد کے ادوار میں قادیانیت سے متعلق علماء کی توجہ، ردقادیانیت کے مراکز کا قیام، اس موضوع سے متعلق کتابوں کی نشر واشاعت کی جو کوششیں پورے ہندوستان بلکہ عالم اسلام میں ہورہی ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے مولانا مرحوم کی خواہش پوری ہوتی نظر آرہی ہے، اور جب بھی عقیدہ ختم نبوت کو تحفظ فراہم کرنے اور وقت کے جھوٹے نبیوں کے ارتدادی عزائم پر تیشہ چلانے والے مجاہدین کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس میں ایک اہم نام مولانا مرحوم کا بھی ہوگا کہ ان کے بغیر یہ تاریخ ادھوری سمجھی جائے گی۔

ردّ شیعیت

یہود وہ قوم ہے جس نے اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والے خدا کے دین میں تحریف کر کے اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا، پھر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف منظّم سازشیں کرنا ان کی فطرت کا حصہ بن گیا، رسول اللہؐ کی بعثت اور ہجرتِ مدینہ کے بعد سے ہمیشہ ان کی سازشیں یہ رہیں کہ اس دین کی نہ تو تصدیق کی جائے، نہ اس کو کسی طرح جڑ پکڑنے دیا جائے اور جڑ پکڑ جائے تو اسے ہمیشہ کے لئے نیست ونابود کردیا جائے، شیعوں کے تمام فرقوں کا بہت کچھ تانا بانا انہی یہودیوں سے ملتا ہے، عبداللہ بن سباء کے فکر وتخیل نے سبائیت کو جنم دیا، بعد کے شیعہ فرقوں میں سبائیت کی روح کم وبیش سب میں حلول کی ہوئی ہے، اس سلسلہ کا ایک مضمون مولانا محبوب الرحمٰنؒ نے ''شیعیت خود اپنے آئینے میں'' کے عنوان سے تحریر فرمایا ہے، جو اس حقیقت کا غماز ہے کہ مولانا کا مطالعہ کتنا گہرا اور نظر کیسی عمیق تھی، یہ ایک قیمتی مضمون ہے اور اس کے بارے میں مولانا ابوسحبان

روح القدس ندوی یوں گہرافشانی کرتے ہیں:

''یہ مضمون دریا کو کوزے میں بند کردینے کا مصداق ہے، فاضل مضمون نگار نے تحریف قرآن اور احکام شرعیہ کے متعلق شیعی نقطۂ نظر پر بھرپور روشنی ڈالی ہے اور شیعہ مذہب کے بنیادی عقائد؛ تقیہ، متعہ اور مسئلہ بداء جیسے خطرناک رجحان کو زیر بحث لائے ہیں''۔

نیز تکفیر صحابہ اور تفویض کے عقیدے سے پردہ اٹھایا ہے، مولانا ازہریؒ اپنے قیمتی مضمون کے اختتام میں فرماتے ہیں:

''اس گروہ کی امت اسلامیہ سے عداوت ابتداء ہی سے واضح ہے...... محدثین اور ائمہ رجال نے ان کو مبتدع اور روایت میں ان کو متروک قرار دیا ہے، اور اپنے اپنے عہد میں ان کی اسلام دشمنی کا اعلان کیا ہے، اب بھی موجودہ پروپگنڈے کے پیش نظر ضرورت ہے کہ ان کے کفر بوّاح کو امتِ مسلمہ کے سامنے پیش کیا جائے''۔

شائستہ مباحثے

مناظروں اور مباحثوں میں فریق مخالف کو کسی طرح چپ کرانا، مسکت والزامی جواب، زبان وادا کی ناشائستگی عام بات ہے، مگر مولانا کے مباحثوں میں ان چیزوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، مولانا منطقی انداز میں بات کرتے ہیں، اور فریق مخالف کو قائل کرنے کے ساتھ مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں، قادیانیوں سے مباحثوں میں مرزا صاحب کی عبارتوں کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قادیانی کے لئے اس کو توجیہ مشکل ہوتی ہے، اور عموماً فروعی موضوعات کے بجائے اصل عناوین پر بحث کرتے ہیں، اگر فریق ثانی الجھائے بھی تو بڑی آسانی سے اپنے موضوع پر آجاتے ہیں، اس طرح مولانا کے مباحثوں سے مباحثوں کا ادب سامنے آتا ہے، سفر قایان میں آپ نے متعدد مباحثوں کا

ذکر کیا ہے، ہم بطور مثال لکھنؤ کا ایک مباحثہ نقل کرتے ہیں:

ایک روز بعض طلبہ نے جو محمد علی لین کی مسجد میں تھے مجھ سے ذکر کیا کہ بعض قادیانی ہم لوگوں سے گفتگو کیلئے آرہے ہیں، آپ آجایئے، میں نے ان سے کہا کہ میرا تعارف نہ کرایا جائے، میں حاضر ہوجاؤں گا، سیتا پور کے مبلغ صاحب مع دو قادیانیوں کے پہنچے، اور مختصر سی مجلس میں مبلغ صاحب نے اپنی لن ترانیاں اڑائیں، ساتھ ہی بار بار قرآن وحدیث کی طرف اشارہ کرتے رہے، کچھ دیر سننے کے بعد میں نے کہا کون سا قرآن؟ تو انہوں نے بڑے شدومد کے ساتھ کہا قرآن معروف ہے، دنیا میں موجود ہے، اس میں کوئی غلطی یا تحریف نہیں ہے، میں نے سوال کیا اگر کوئی اس میں ردوبدل کردے تو اس کا کیا حکم ہے؟ وہ کہنے لگے کافر، ملحد، جہنمی ہوگا، میں نے ان سے کہا کہ یہ جملہ تحریر فرمادیجئے کہ جو ''شخص قرآن میں ردوبدل کرے وہ کافر ملحد جہنمی ہے'' انہوں نے فوراً تحریر کردیا، میں نے کہا یہ بھی لکھ دیجئے کہ ''خواہ وہ مرزا غلام احمد کیوں نہ ہوں'' اس پر وہ بہت اچھلے کودے کہ مرزا جی نے تو یہ کہا ہے کہ جو شخص قرآن میں اک شوشہ بڑھائے تو وہ کافر ملحد ہے، میں نے کہا، مرزا جی نے تذکرہ میں لکھا ہے ''انا انزلناہ من القادیان'' قرآن میں ہے، ہمارے قرآنوں میں تو اس کا وجود نہیں ہے، وہ کہنے لگے آپ کو دکھانا ہوگا، میں بالکل تیار ہوگیا کہ میں ابھی کتاب لا رہا ہوں، وہ مجھے مہلت دینا چاہتے تھے، میں نے صرف اتنی مہلت چاہی کہ میں ڈالی گنج سے کتاب لاسکوں، حیلہ بہانہ کرکے آئندہ جمعرات کو آنے کا وعدہ کرکے چلے گئے، پھر کون آتا ہے؟

مولانا موجودہ دور کے رسم جہیز کے خلاف تھے

اسی طرح مولانا مرحومؒ نے موجودہ دور کے رسم جہیز کے خلاف سختی سے کام لیا، حتی

المقدور اس کو روندنے اور کچلنے پر کوشاں رہے، مولاناؒ کی صاحبزادی ’’رفعت محبوب‘‘ صاحبہ تحریر کرتی ہیں، ’’ابوجان جہیز جیسی ملعون بیماری کے خلاف تھے، نہ دینا پسند تھا اور نہ لینا ہی پسند، اپنی شادی بھی سادے انداز سے کی اور اپنے بچوں کی بھی، بیٹوں کی شادی طے کرنے کے موقع پر لڑکی کے والدین سے صرف دوشرطیں رکھتے، ہماری بہو بننے کے بعد اس کو ہمارے گھر میری زندگی تک برقع پہنّا ہوگا، ٹی وی، ریڈیو، میوزک کی کوئی چیز میرے گھر نہ بھیجئے گا۔(۱)

مولانا کا نکاح اور اس کی سادگی

مولانا اور ان کے والد کی سادگی اور دینداری کا اندازہ اس واقعہ سے بھی کیا جاسکتا ہے، جو بہت معروف ہے کہ ایک مرتبہ مولانا محبوب الرحمٰن صاحب ازہری کے والد نے ایک صبح انہیں اپنا ایک خط لیکر اپنے بھائی کے پاس بھیجا جو خیرآباد میں رہا کرتے تھے، مولانا صبح کی ٹرین سے لکھنؤ سے خیرآباد کے لئے روانہ ہوئے، اور دن چڑھے پہنچ گئے، چچا کو خط دیا، تھوڑی دیر ان کے یہاں رکے، دوپہر کا کھانا کھایا اور واپس ہونے کی اجازت چاہی، چچا کو اس اجازت طلبی پر حیرت ہوئی، انہوں نے دریافت کیا، کیا بھائی صاحب نے تمہیں کچھ نہیں بتایا تھا، مولانا نے نفی میں جواب دیا، چچا نے بتایا کہ جو خط تم لائے ہو اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ اگر مناسب سمجھو تو اپنی بیٹی کے ساتھ آج محبوب کا نکاح کردو، لہٰذا ابھی بعد نماز ظہر تمہارا نکاح ہے، ایسا ہی ہوا، نماز کے بعد مولانا کے چچا صاحب نے جب مسجد میں اعلان کیا کہ ابھی میری بیٹی کا نکاح ہونا ہے، تو لوگ حیرت میں رہ گئے کہ یہ کیسا نکاح ہے کہ جس کا کوئی تذکرہ پہلے سے نہیں تھا، بعد نماز ظہر نکاح ہوا اور عصر بعد مولانا اپنی

(۱) میں اور میرے ابو صفحہ ۲۵۔

اہلیہ کولیکر لکھنؤ کے لئے روانہ ہوگئے ،اللہ ! اللہ! کیا ہی اعلیٰ قسم کی دینداری تھی ، یقیناً غلط عقائد کوختم کرنے میں مرد مومن،اوررسم ورواج کوترک کرنے میں مردمجاہد تھے۔

مولانا نے غلط رسم ورواج کومٹانے میں

پوری قوت صرف کردی

مولانا مرحومؒ نے غلط رسم ورواج کومٹانے میں پوری قوت صرف کردی، دفعِ مضرت کیلئے ہمہ تن گوش ہوکرمخالفین اسلام کارد کیا ،آپ نے روح انسانیت کی شجر کاری وآبیاری کی جس سے روح افزا چمن تیار ہوا،آپؒ نے چمن محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کوسیراب ومستفیض کیا،آپ نے جومشن اختیار کیا اس کا بارگراں،راہ پر پیچ اور تکمیل انتہائی نازک عمل تھا،لیکن اس میں پوری طرح انہماک رہا، پھرآپ نے ایسا نہیں کیا: ؎

چلتے ہیں تھوڑی دور ہر ایک راہ رو کے ساتھ

مولانا مرحومؒ نے قدم اٹھایا خلیج اسلام کوہموار کرنے کے لئے ،دراڑ کو پاٹنے کیلئے ، بدعات وخرافات اورشرکیات کونیست ونابود کرنے کیلئے ،اعمال ضالہ کو بیخ وبن سے اکھاڑنے کیلئے ، جب زبان کی ضرورت محسوس ہوئی اس کواستعمال کیا ،قلم کی ضرورت ہوئی تو زورقلم ثبت کرکے بتادیا کہ راہِ حق اپنالوورنہ انجام ’’ان الباطل کان زھوقا‘‘ ہوگا، ظلوم وجھول کی اصلاح کرنے کیلئے اسفار کئے ،دورے کئے اورمقالات تحریر کئے ، اوراسلام دشمنی کے تعارف میں قیمتی سے قیمتی مضامین لکھے ، بحث ومباحثہ کے بازارگرم کرتے رہے اورہرممکنہ طور پرتردید کیلئے کمربستہ رہے۔

آپ کے چار کارنامے

مولانا سید ضیاء الحسن صاحب آپ کے چار اہم کارنامے شمار کراتے ہیں:

(۱) مدرسہ عالیہ کلکتہ اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی تدریسی خدمات، جنکی بدولت ملک اور بیرون ملک میں آپکے ہزاروں شاگرد آپ کے مشن کو آگے بڑھانے میں مصروف ہیں۔

(۲) ''قادیانیت'' کے خلاف تحریک۔

(۳) اصلاح معاشرہ کی خدمات اور کاوشیں۔

(۴) سب سے اہم کارنامہ اپنے علاقہ میں ''جلیلیہ'' کے نام سے ایک مدرسہ واسکول کا قیام۔

باب پنجم

صفات وخصوصیات

تمہید

انسان کے اخلاق وکردار، اس کی خصوصیات وصفات اوراس کی زندگی کے رہن سہن اورلوگوں کے ساتھ اس کے تعامل سے اس کی شخصیت کا سراپا واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ اس شخصیت کی کیا خصوصیات وصفات تھیں، جن سے ان کو مقبولیت حاصل ہوئی اور پسندیدہ شخصیات میں ان کا شمار ہونے لگا اور لوگوں کے لئے وہ قابل تقلید وقابل استفادہ ہوگے اور جن کو آنے والی نسلوں کو اختیار کرنا چاہئے، چنانچہ یہاں مولانا محبوب الرحمٰن صاحب کی بعض وہ خصوصیات وصفات بیان کی جاتی ہیں، جن سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، اور مولانا کی شخصیت کو سمجھا جاسکتا ہے۔

مولانا اسم بامسمّٰی تھے

آپ کے شاگرد مولانا واضح رشید صاحب حسنی ندویؒ آپ کی خصوصیات کے بارے میں لکھتے ہیں: استاد گرامی حضرت مولانا محبوب الرحمٰن ازہری گوناگوں خصوصیات اور انفرادی صفات کے حامل عالم ومعلم دین اور مشفق اور محبوب مربی تھے، ایسا بہت کم ہوا ہے کہ اسم اور مسمّیٰ میں پوری مطابقت اور مناسبت ہو، ہمارے موقر استاد مولانا محبوب الرحمٰن

ازہریؒ کی دیگر خصوصیات وامتیازات کے ساتھ ایک خصوصیت طلبہ اوراساتذہ میں ان کی محبوبیت تھی،ہمیں کئی سال ان سے استفادہ کی سعادت حاصل ہوئی، بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ عربی تعلیم کی ابتداءان کی شاگردی میں ہوئی،اورعربی ادب کی اعلی کتابیں بھی ان سے پڑھیں۔

مولانا کی قوت ایمانی

مولاناواضح صاحب لکھتے ہیں: ایک بڑی خصوصیت جوہم کومولانا کے تعلق سے محسوس ہوئی وہ مولانا کی قوت ایمانی تھی،وہ اس پر پورایقین رکھتے تھے کہ " قل لن يصيبنا إلاما كتب الله لنا، هو مولانا، وعلى الله فليتوكل المؤمنون" ۔(۱)

آپ فرمادیجیے کہ ہم پر کوئی حادثہ نہیں پڑسکتا مگر وہی جواللہ نے ہمارے لیے مقدرفرمایا ہے،وہ ہمارا مالک ہےاوراللہ کےتوسب مسلمانوں کواپنے سب کام سپرد رکھنے چاہئیں اور فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ "اعلم أن الأمة لو اجتمعت على أن ينفعوك بشئ لم ينفعوك إلا بشئ قد كتبه الله لك، وإن اجتمعوا على أن يضروك بشئ لم يضروك إلا بشئ قد كتبه الله عليك" ۔(رواہ الترمذی)

(جان لو کہ اگر پوری امت تم کوکوئی نفع پہنچانے پر متفق ہوجائے تب بھی نفع نہیں پہنچاسکتی سوائے اس کے جواللہ نے تمہارے لیےمقدر کردیا ہے،اوراگرسب ملکر تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہیں تب بھی کوئی نقصان نہیں پہنچاسکتے سوائے اسکے جواللہ تعالی نے مقدر فرمادیا ہو)وہ اکثر اس حدیث کو بیان فرماتے ،اوراسی پر عامل تھے،جنگ عظیم میں جب سفرمخدوش تھا،اپنے والدمحترم کےحکم پرانہوں نے مصر سے ہندوستان کا سفرکیا،اس کا ذکر وہ اکثر کرتے تھے۔

(۱)(سورہ توبہ:۵۱۔

ان کی گفتگو سے عیادت کرنے والوں کے

ایمان اوراطمینان میں اضافہ ہوتا تھا

اس کے علاوہ دیگر خطرات اور امراض کے موقع پر مولانا کی یہ امتیازی خصوصیت سامنے آتی تھی، آخری عمر میں مختلف امراض میں مبتلا ہوئے، عیادت کرنے جو جاتا اس سے کبھی اپنی تکلیف یا پریشانی کا ذکر نہ کرتے، بلکہ اطمینان کا اظہار کرتے، آخر وقت تک مولانا کی یہی کیفیت رہی، ان کی گفتگو سے عیادت کرنے والوں کے ایمان اور اطمینان میں اضافہ ہوتا تھا، صبر وشکر دونوں حالتوں میں مولانا کا یہی طریقہ اور انداز رہتا تھا، جو ایک مومن کا ہونا چاہئے۔

قرآن کریم سے تعلق وشغف

مولانا کے خانوادے میں حفاظِ قرآن کی کثرت تھی، آپ نے خود نو سال کی عمر میں مدرسہ فرقانیہ میں حفظِ قرآن مکمل کیا تھا، مولانا کے بھانجے مولانا محمد نعیم ندوی لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ میرا ننہیالی خانوادہ حفاظِ قرآن کا مجمع ہے، قرآن کے حفظ وتجوید کے ساتھ اتنے طویل وتسلسل اور شدت اہتمام کی نظیر کم ہی مل سکے گی''۔

حضرت مولانا سید محمد رابع ندوی مولاناؒ کے شغف قرآن کے بارے میں فرماتے ہیں: ''قرآن مجید سے تعلق اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ ستر محرابیں انہوں نے قرآن مجید کی سنائیں''۔

قرآن سے والہانہ شیفتگی اور تجوید میں درک وپختگی کی ہی بات تھی کہ مولانا مرحوم نے ''مکہ مکرمہ میں منعقدہ عالمی مسابقۂ قرآن میں ندوۃ العلماء کی نمائندگی کرتے ہوئے حسب ذیل سالوں میں حکم کے فرائض انجام دئے

:۱۴۰۸ھ،۱۴۱۱ھ،۱۴۱۲ھ،۱۴۱۳ھ۔

پھر سعودی سفارت خانے نئی دہلی کی جانب سے منعقدہ مسابقۂ قرآن وحدیث میں ۱۴۲۲ھ میں بحیثیت حکم وصدر شرکت فرمائی۔

زہدواستغناء

مولانا کی زندگی میں زہدواستغناء ایک امتیازی وصف کی حیثیت رکھتا ہے، کچھ تو خاندانی اثر کا نتیجہ تھا، کچھ ان کے دینی مزاج کا حصہ،اس امتیازی وصف کی بابت مفتی محمد ظہور صاحب لکھتے ہیں:''ان کی خصوصیات میں ایک اہم خصوصیت استغناء کی تھی،فرمایا کرتے تھے''لاتسئل احدا......''کسی سے خدمت لینا،کسی چیز کوطلب کرنا ایک گناہ سمجھتے تھے......کلکتہ میں بہت سے اصحابِ خیر تھے،کبھی کسی امیر سے انتفاع کا کوئی تعلق نہیں رکھا، بلکہ سب کے محتسب ہی رہے:

اپنا سا زور کر کے تھکے منعمان دہر
مٹھی نہ کھل سکی مرے دست سوال کی

سادگی ومروت

مولانا تو بس سادگی کا زندہ پیکر تھے، بے تکلف سراپا، ریاوتصنع کا دور دور تک کوئی شائبہ نہیں، زندہ دلی، خندہ جبینی، بشاشتِ قلبی اور چہرے پر معصومیت ہویدا،ایک ندوی فاضلکہتے ہیں:''مولانا بہت ہی سادہ مزاج تھے،بڑے ملنسار تھے،بے انتہا خلیق تھے ،بڑے ہنس مکھ تھے،چھوٹا محسوس نہیں کرتا تھا کہ ان کے سامنے وہ چھوٹا ہے......اپنی مسکراہٹ سے وہ ماحول کونہایت ہی خوبصورت بنادیتے تھے''۔

صبر واستقلال

وہ مولانا کا صبر واستقلال اوران کی قوتِ ایمانی ہی تھی کہ وطن سے دور مدرسہ صولتیہ اور جامع ازہر میں برسہا برس حصول علم کے شوق میں گزارے، عمر کے آخری حصے میں جس عزیمت و پامردی کیساتھ وہ اپنے امراض سے برسرِ پیکار رہے، وہ ان کے صبر واستقلال کی زندہ مثال ہے، مولانا مفتی محمد ظہور ندوی لکھتے ہیں: ''صبر میں ان کو ایسا کمال حاصل تھا کہ شاید کم مثالیں ملیں گی، کئی بار وہ ایسے بیمار پڑے کہ خیال ہوتا تھا کہ اب وہ چلے جائیں گے، لیکن صبر ایسا کہ کوئی بات ہی نہیں، اسپتال میں داخل ہونے کے لئے تیار نہیں ہوتے......اندر خواہ کتنی ہی تکلیف ہو، شدید بے چینی ہو، درد ہو، گھبراہٹ ہو، مگر کیا مجال کہ پیشانی پر بل پڑ جائے، یا زبان سے کوئی بے صبری کا جملہ نکل جائے''۔

حق گوئی و جرأت ایمانی

زاہدانہ شان سے جینے والے، اپنی خودی وخودداری کی پاسداری کرنے والے ہی حق گوئی و بے باکی کی صفت سے متصف ہوتے ہیں، مولانا میں مذکورہ بالا صفات تھیں، اس لئے وہ حق گوئی اور جرأتِ ایمانی کے اظہار میں پیش پیش رہے، خصوصیت کے ساتھ ''قادیانیت'' کا جس جرأت وحمیت سے انہوں نے مقابلہ کیا اور شیعیت کی تردید میں حق گوئی برتی وہ ان کا عظیم کارنامہ ہے، جسے فراموش نہ کیا جاسکے گا۔ ایک ندوی فاضل انکے اس وصف خاص پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

''مولانا مرحوم کے نمایاں اوصاف میں ایک وصف حق گوئی، جرأتِ ایمانی اور بے باکی تھا، کتمانِ حق، یارو رعایت، یا لگی لپٹی بات کا مزاج نہ تھا، یہی قلندروں کا طریق ہوتا ہے''۔

ہزار خوف ہو لیکن زبان ہو دل کا رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

ڈاکٹر سید سلمان ندوی بن علامہ سید سلیمان ندویؒ ساؤتھ افریقہ مولانا ابوسحبان ندوی کے نام اپنے تعزیتی ای میل میں فرماتے ہیں: ''ان کی پوری زندگی حق گوئی کا آئینہ تھی''۔

اعتدال وتوازن

مولانا ایک بصیرت مند عالم دین تھے، ان کی فطرت سلیم اور ان کا ذوق پاکیزہ تھا، انہوں نے علم وفن کے مختلف میکدوں میں ساغرِ معرفت چھلکایا تھا، اپنے ملک اور ملک سے باہر مختلف اداروں، تنظیموں، تحریکات اور افکار وخیالات کا مطالعہ، تجربہ اور مشاہدہ کیا تھا، والد ماجد ندوی عالم وفاضل تھے، خود کا مزاج ندویانہ تھا، ان خوبیوں نے آپ کی فکر وخیال اور سلوک وبرتاؤ میں اعتدال وتوازن پیدا کر دیا، ایک ندوی فاضل کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''مولانا کی طبیعت میں جو اعتدال تھا، جو گداز تھا، مسلک کے بارے میں ان کے یہاں جو امتزاج تھا، مختلف مسالک کے درمیان جو ربط وتعلق ان کے ذہن میں موجود تھا ...... یہ ندویت کی خاص صفت ہے کہ ندوی ایک آفاقی ذہن لے کر آگے بڑھتا ہے، اس کے اندر عالمیت (عالمگیریت) ہوتی ہے، یہ بات مولانا کے اندر بدرجہ اتم موجود تھی، یعنی ایسی تھی کہ اس کو اپنا رہنما بنانا چاہئے''۔

مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی لکھتے ہیں: ''مولانا علیہ الرحمہ کی فکری نشو ونما ایسے علمی مراکز میں ہوئی، جہاں ہر مشرب ومسلک کے علماء ومشائخ سے انہیں فیض یاب ہونے کا موقع ملا، اس لئے ان کی فکر وتخیل میں اعتدال تھا، لہٰذا ہر مکتب فکر کے اہل علم سے ان کے گہرے روابط تھے''۔

مولانا کی سادگی اور تواضع

مولانا مرحوم کے ہونہار فرزند مولانا سعید الرحمٰن فیضی ندوی بانگ حراء ازہری نمبر ص (۵۲) پر رقم طراز ہیں: ’’والد مرحوم سادہ مزاج تھے، لباس وطعام اور ہر چیز میں سادگی پسند فرماتے، جب کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑی وسعت وخوشحالی عطا کی تھی، ان کی زندگی بعد میں آنیوالوں کیلئے ایک مثال ونمونہ اور مشعل راہ ہے، والد محترم بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ شہرت، نام ونمود سے دور رہتے، اللہ تعالیٰ نے انہیں بے شمار فضل وکرم سے نوازا تھا، ان کے گونا گوں محاسن، اخلاق وفضائل ورع وتقویٰ اور دینی غیرت وحمیت ان شاء اللہ، ان کے سفر آخرت کیلئے زادراہ ہوں گے۔‘‘

پروفیسر انیس چشتی بانگ حراء ازہری نمبر ص ٦٦ پر رقم طراز ہیں: ’’تھکن انہیں چھو کر بھی نہیں گزرتی تھی، مولانا بہت کم کھاتے، اور بہت دھیمے بولتے تھے، اس لئے وہ صحیح معنوں میں مجلسی آدمی تھے، گفتگو بہت ترتیل اور صحافتی انداز میں کرنے کے قائل تھے۔ ہر جملہ نہایت تراشا ہوا اور بالکل ایڈٹ کیا ہوا زبان سے نکلتا تھا۔ نہ حشو نہ زوائد، آپ چاہیں تو لکھتے چلے جائیں، ایک نشست میں ایک پورا رسالہ تیار ہو جائے گا۔‘‘

مولانا ندوی زادہ اور ندوی گر تھے

مولانا فیصل احمد بھٹکلی ندوی بانگ حراء ازہری نمبر صفحہ ۷۱ پر یوں رقمطراز ہیں: ’’مولانا محبوب الرحمٰن ازہری تقریباً پوری صدی پر مشتمل مختلف قسم کی حسین یادوں کو اپنے ساتھ لے گئے، وہ ایک ملنسار اور سادہ مزاج شخص تھے، قدیم علمائے ندوہ کی طرح سادگی ان کے مزاج میں بسی ہوئی تھی، وہ اگرچہ ندوی نہیں تھے مگر اس کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ اور فکراً عملاً سو فیصد ندوی تھے، طویل عرصے تک ندوہ میں تدریس اور پھر علمائے

ندوہ سے قربت نے پوری طرح ان کو ندوی مزاج میں ڈھال دیا تھا، وہ خود ہی فرماتے تھے کہ ''لوگ مجھے ندوی سمجھتے ہیں'' میں ندوی تو نہیں ہوں، مگر ندوی زادہ اور ندوی گر ہوں''۔

مولانا کے یہاں ضابطہ کا نفاذ تمام طلبہ پر یکساں ہوتا تھا

مولانا شیخ ابرار صاحب ندوی بانگ حراء ازہری نمبر میں مولانا محبوب الرحمٰن صاحب کے اوصاف بیان کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں، مولانا مرحوم فرماتے ہیں: ''میں زبانی کسی بھی قضیہ کو حل کرنے کا قائل نہیں ہوں، زبان سے کس نے کیا کہا، کس کو یاد؟ اس لئے بھی ہر قضیہ کو، ہر کارروائی کو اول تا آخر تحریر ہونا چاہئے، میں اپنے آپ کو فیصلہ کا مجاز نہیں سمجھتا ہوں، ہم سب تو کارکن ہیں فیصلہ کا اختیار تو مہتمم صاحب کو ہے، اس سے ادارہ کے اجتماعی نظام میں استحکام رہتا ہے، میرا فیصلہ کچھ اور مہتمم صاحب کا کچھ اور، اس سے بگاڑ ہوتا ہے، پس یہی وجہ تھی کہ مولانا علیہ الرحمہ کی رائے ہمیشہ دفتر اہتمام و نظامت سے بھی ''تصویب'' ہی پاتی تھی، اور کبھی بھی مولانا کو اپنی رائے و فیصلہ سے نزول یا رجوع کرتے نہیں دیکھا، مولانا کبھی کسی طالب علم کا ہدیہ قبول نہیں فرماتے، بلکہ طلبہ سے اپنا ذاتی کام لینا بھی گوارا نہ تھا، فرماتے ہدیہ لینا کام کرانا، یہ ضابطہ کے نفاذ میں حجاب بنتا ہے، یہی وجہ تھی کہ آپ کے یہاں اصول وضوابط کے نفاذ میں کوئی لچک نہیں تھی، ضابطہ کا نفاذ تمام طلباء پر یکساں ہوتا''۔

بے لوث مخلص و مربی

ایک بڑے ندوی فاضل نے مرحوم کی زندگی کا نقشہ بہت ہی اچھوتے انداز میں کھینچا ہے کہ ''مولانا محبوب الرحمٰن ازہری کی زندگی محض عمر دراز کے چار دن نہیں تھے'' جو آرزو یا انتظار میں کٹ گئے بلکہ مولانا کی زندگی ایک ایسے عالم دین، بے لوث مخلص، مربی،

کامیاب معلم اور خادم قرآن وسنت کی زندگی تھی، جو اپنے قابل قدر کارناموں اور صفات کی وجہ سے نہ صرف یادگار رہے گی بلکہ قابل تقلید رہے گی۔

مولانا کی زندگی قابل تقلید

مولانا محبوب الرحمٰن ازہریؒ کی خانگی، انفرادی اور معاشرتی زندگی بھی ہم سب کیلئے قابل تقلید ہے، مولانا انتہائی خوش اخلاق متواضع اور مہمان نواز تھے، ایک اجنبی بھی مولانا سے ملتا تو وہ مولانا کی بڑائی اور عظمت لئے واپس ہوتا، مولانا اقبال احمد اعظمی ندوی مدنی مہتمم معہد الفردوس نے مولانا ازہری سے اپنی پہلی ملاقات کی جو کیفیت سپرد قرطاس کی ہے، اس سے مولانا کی شخصیت کے متعدد گوشے اجاگر ہوتے ہیں، وہ لکھتے ہیں: تلاش کرتا ہوا مولانا کے دولت کدہ پر پہنچا، جہاں ایک تختی (نیم پلیٹ) لگی ہوئی تھی جس پر محبوب الرحمٰن ازہری لکھا ہوا تھا، اجازت کے بعد ملاقات کا شرف حاصل ہوا تو کیا دیکھا کہ نورانی چہرہ، چمکتی کشادہ پیشانی، کھلتا ہوا گندمی رنگ، سادہ طبیعت، حلیم و بردبار، ملنسار، خوش اخلاق، خوش مزاج، مہمان نواز، غیور وخوددار، اخلاص وللّٰہیت کے پیکر، صلہ رحمی کے خوگر، فرشتہ صفت دبلے پتلے انسان، جنہیں دیکھ کر بے ساختہ عربی کا ایک شعر زبان پر آ گیا: ؎

ترى الرجل النحيف فتزدريه
وفـــي أثوابـــه أســـدٌ مزير
فما عظـم الرجال لهم بفخر
ولكـــن فخرهـم كرمٌ وخيرُ

مولانا فرشتہ صفت انسان تھے

اللہ تعالی نے مولانا کو بہت سی خصوصیات سے نوازا تھا، طبیعت کے بڑے نیک تھے،

فرائض کی ادائیگی کے ساتھ تہجد اور آداب سحر گاہی کے خوگر تھے، زہد وورع، احتیاط وتقویٰ مولانا مرحوم کی زندگی کا امتیاز تھا، مولانا کے اندر خوش خصالی، خوش اخلاقی، خوش مزاقی، پاکیزہ خیالی، معیاری ادبی ذوق، استغناء اور بے نیازی جیسی صفات بدرجۂ اتم موجود تھی۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مولانا مرحوم جہاں ایک طرف سنجیدہ گفتار، صاحب کردار، نہایت ملنسار، اکابر واسلاف کی روایت وانداز کے علمبردار، درس وتدریس کے معاملے میں تجربہ کار تھے تو وہیں دوسری طرف تحمل اور بردباری تواضع وانکساری کے حسین سنگم تھے۔

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز

مولانا خودآگاہ وخداشناس تھے

آپ مردحق، خودآگاہ وخداشناس، دریائے علم وادب کے شناور، عالم بے بدل، ادیب بے مثال اور مصنف باکمال، نکتہ آفرین ونکتہ شناس قلمکار تھے، بقول مولانا شیخ ابرار صاحب ''آپ بڑے خلیق مزاج، بڑے پن کے تکلف سے آزاد تھے'' اور بقول مولانا ابوسحبان روح القدس صاحب ''آپ نے پوری زندگی صبر وثبات، زہد وتقویٰ میں بسر کی اور علم دین کی خدمت میں مصروف رہے'' اور بقول مولانا محمد قیصر حسین ندوی صاحب ''آپ رحمان کے محبوب ہونے کے ساتھ ساتھ حسن اخلاق، حسن گفتار، ملنساری، تواضع اور خاکساری کی وجہ سے عباد الرحمٰن کے بھی محبوب تھے''۔

آپ دنیوی جاہ ومنزلت کی طلب، جلب منفعت اور حصول مال وزر کی تڑپ اور دنیوی حرص وطمع کی آلودگی سے پاک تھے، آپ کی زندگی عفو ودرگذر، معاملہ فہمی اور حسن معاشرت

سے عبارت تھی، مختصر یہ کہ آپ جامع صفات وکمالات تھے، اور حقوق اللہ وحقوق العباد کی رعایت وحفاظت اور امانت ودیانت کے پیکر تھے، تعلقات کو ہر حال میں قائم رکھنے میں مہارت تامہ کے علمبردار تھے۔ بقول شاعر ؎

لا أرتضی حبا اذا هولم يدم
عنـد الجفاء و قلـة الانصاف

مولانا کی سعادت مندی

نیز آپ حافظ قرآن کے فرزند ارجمند، حافظ قرآن کے برادر محترم اور ایک نہیں تین تین حفاظ کرام کے والد بزرگوار اور خود بھی ماشاءاللہ حفظ قرآن کی دولت گراں مایہ سے مالا مال تھے، اسی پر بس نہیں بلکہ آپ امیدوں کے مرکز، آرزوؤں کے منتہی، بلد امین

جہاں نہ گھاس اگتی ہے نہ کوئی پھول کھلتا ہے
مگر اس سرزمیں سے آسماں بھی جھک کے ملتا ہے

یعنی مکہ مکرمہ کے مہمان خاص بھی بنے، سچ ہے ؎

یہ رتبۂ بلند ملا، جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دارورسن کہاں

طلبہ واساتذہ کی مؤثر شخصیات

طلبہ کے ساتھ ساتھ اساتذہ میں بھی مولانا کی شخصیت مؤثر شخصیت تھی اور مجلس اساتذہ کے سکریٹری ہونے کی وجہ سے وہ اساتذہ کے نمائندہ تھے، عالم عربی اور عالم اسلامی سے آنے والے مہمانوں کے استقبال کا بھی وہ اہتمام کرتے تھے، اس لیے کہ وہ ان کے مراتب اور علمی مقام سے خاص طور سے عالم عربی سے آنے والوں کی حیثیت سے واقف

تھے، اکثر وہ استقبالیہ کلمات تحریر کر کے طلبہ کو اس کے لیے تیار کرتے تھے۔

مولانا کی سیرت و کردار کی تعمیر اور شخصیت کی تشکیل میں تین بنیادی عوامل

انسان کی سیرت وکردار کی تعمیر اور شخصیت کی تشکیل میں تین بنیادی عوامل (Factors) کارفرما ہوتے ہیں، مثبت طور پر ان عوامل کو اثر انداز ہونے کا موقع ملے تو اخلاق کریمانہ کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں، جبکہ منفی عوامل انسان کو شیطان بھی بنا دیتے ہیں۔

اول: خاندانی خصوصیات، مولانا کا پورا گھرانہ حفاظِ قرآن اور دین داروں کا گھرانہ تھا، اس لئے ورثہ میں آپ کو دینی محبت اور اسلامی روایات ملیں۔

دوم: ماحول، جب تک آپ لکھنؤ میں رہے مدرسہ فرقانیہ، فرنگی محل اور ندوۃ العلماء کے اساتذہ کے علمی، دینی اور روحانی ماحول میں رہے، پھر ثانویہ کی تعلیم کے لئے مدرسہ صولتیہ کی علمی دنیا اور بیت اللہ کی روحانی فضا اور حرم کی نورانی مجلسوں میں دل ودماغ کو جلا بخشی، ازہر پہنچے تو وہاں کے ماحول نے علم کو پختہ، فکر کو بالیدہ اور یقین کو مستحکم بنا دیا۔

سوم: ذاتی محنت اور جذبہ وشوق، یہ عنصر بھی آپ کی زندگی میں بہت نمایاں رہا اور یہی چیز آپ کو وقت کے مشہور ترین علمی مراکز کی سیر کراتی رہی، جہاں آپ کا علم ترقی پذیر رہا، تجربہ بڑھتا گیا اور شخصیت میں نکھار پیدا ہوتا رہا، پھر ان عناصر ثلاثہ نے مل کر آپ کے اندر چند امتیازات وخصوصیات پیدا کردیں جن کا یہاں اختصار کے ساتھ تذکرہ کیا جاتا ہے۔

مولانا کی نمایاں تین خصوصیات

مولانا قیصر صاحب ندوی بانگ حراء ص ۷۰ پر یوں رقمطراز ہیں: ”مولانا متعدد خصوصیات کے حامل اور مختلف امتیازات سے متصف تھے، ان میں سب سے نمایاں تین

خصوصیات تھیں:

(۱) اخفاء واستغناء، اپنے حال پریشانی اور مصائب کا از حد اخفاء فرماتے۔

(۲) مولانا جاہ ومنصب، شہرت ونا موری کے پیچھے نہیں پڑتے تھے، بلکہ اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔

(۳) تیسری امتیازی خصوصیت توکل علی اللہ تھی، آپ کو اللہ کی ذات پر کامل بھروسہ اور مکمل اعتماد تھا، آپ کی ضرورت خواہش اور مصیبت کی وجہ سے کبھی چہرہ پر شکن تک نہیں آتی بلکہ میں کبھی اپنی گھریلو الجھن اور پریشانیوں کا تذکرہ کرتا تو فرماتے اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط کرو ساری پریشانیوں اور مصیبتوں کا حل اللہ تعالیٰ سے تعلق جوڑنے اور مضبوط کرنے میں ہے، جو تمہارے مقدر کا ہے تمہیں مل کر رہے گا اور جو نہیں ہے اس کو تم کسی قیمت پر حاصل نہیں کر سکتے تو پھر پریشانی کس بات کی؟

امتیازی وصف

آپ کا ایک امتیازی وصف فرق ضالہ کا مطالعہ ہے، شیعیت اور قادیانیت آپ کے فکر وعمل کا خاص محور رہا ہے، اور بطور خاص قادیانیت سے متعلق آپ نے بڑی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں، ایک ندوی فاضل آپ کی سرگرمیوں کا تعارف اس طرح کراتے ہیں:

فرق ضالہ کے مطالعہ اور ان کی تردید، اسلام کے دفاع اور ترجمانی کا جذبہ مولانا مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر عطا فرمایا تھا، نشست وبرخاست اور عام مجلس بھی مولانا کے اس جذبہ اور فکر سے خالی نہیں ہوتی تھی، جس میں اسلام کے دفاع اور فرق ضالہ کی تردید پر گفتگو نہ ہو، اسی کے لئے کتنے دورے مولانا نے کئے، اسفار کئے، مناظرے کئے، مضامین ومقالات لکھے، تدریب الائمہ والدعاۃ کے پروگراموں میں علماء ودعاۃ طلبہ

واساتذہ کواسی موضوع پر خطاب کیا، قادیانیت کا موضوع آتے ہی مولانا کی ایک خاص کیفیت ہوجاتی تھی۔

عربی زبان وادب میں مہارت

ایک امتیازی وصف مولانا کا عربی زبان وادب میں مہارت ہے، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم (ناظم ندوۃ العلماء) آپ کی عربی دانی کا اعتراف کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

وہ دینی علوم اور عربی زبان وادب میں امتیاز رکھتے تھے، اور عربی زبان کی تدریس کا ان کو اچھا تجربہ اور اس سلسلہ میں مہارت حاصل تھی، اسی کے ساتھ انہوں نے دینی علوم میں کمال پیدا کیا اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں حدیث شریف کی اہم کتابوں کا درس دیا، اور کچھ وقت صحیح بخاری اور مسلم شریف جیسی عظیم کتابوں کا درس بھی ان کے ذمہ رہا۔

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی (معتمد تعلیم ندوۃ العلماء) آپ کے عربی پڑھانے کے ایک خاص انداز کی یوں تحسین کرتے ہیں:

عربی زبان وادب کے استاذ کی حیثیت سے ندوۃ العلماء میں موصوف کا تقرر ہوا، اور بہت جلد اپنے جداگانہ انداز تدریس کی وجہ سے ذمہ داروں کی توجہ کا مرکز بن گئے، خاص طور پر عربی زبان کے پڑھانے میں مولانا کا ایک خاص طرز تھا، جس کے مولانا ہی بانی تھے، اس طرح عربی بولنے اور طلبہ میں عربی زبان کا ذوق پیدا کرنے میں انہیں بڑی مہارت تھی، عربی زبان وادب میں طلبہ کا شغف بڑھانے کے لئے مولانا فکرمند رہا کرتے تھے۔

مشہور محقق اور عربی زبان وادب کے ماہر مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی (م:۲۰۰۹ء) جو کلکتہ میں آپ کے رفقاء تدریس میں شامل تھے، وہ آپ کی عربیت کے بڑے قائل تھے، مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی ان کی ایک شہادت اس طرح نقل کرتے ہیں:

مولانا مرحوم کے ۲۸/سالہ رفیق کار علامہ معصومی آپ کی عربیت کے بڑے قائل تھے، بارہا وہ اس کا اظہار فرماتے، راقم کی کتاب ''روائع الاعلاق شرح تہذیب الاخلاق'' جو مولانا معصومی کی علمی رہنمائی کی مرہون منت ہے، اس پر تاریخی تقریظ تحریر فرما کر راقم کے نام ایک مکتوب میں بندہ کو ہدایت فرماتے ہیں: ''ہمارے محترم شیخ الاحبہ کو ایک بار تو شروع سے اخیر تک سنا ہی دیجئے، کہ ان کی فاحش خامیاں بلحاظ زبان وادا وبیان ایک حد تک دور ہوجائیں''۔

نام ونمود اور شہرت سے دور

مولانا مرحومؒ جامع کمالات اور مجموعۂ خصوصیات تھے، آپ کے نمایاں اوصاف اخفاء واستغناء تھا، آپ نام ونمود، شہرت وناموری کے یکسر خواہاں نہیں تھے اور ہر معاملے میں راضی بہ رضا متوکل علی اللہ تھے، یہی وہ تمام شمائل وخصائل ہیں جو آپ کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں، مولانا کی حیات، مختلف النوع خدمات سے لبریز تھی، جن کی وجہ سے آپ کو تادیر یاد رکھا جائے گا۔

آپ کی خدمات ایسی ہیں جو اب بھی تر وتازہ ہیں، آپؒ تو دنیا چھوڑ کر چلے گئے لیکن آپ کی باتیں، آپ کی یادیں پارینہ نہیں ہوئیں، آپ کی زندگی طالبین کے لئے سبق آموز ہے، اس سے ہمیں مختلف طرح کے سبق ملتے ہیں، مولانا مرحومؒ زہد وغنا اور تقویٰ کی صفت سے متصف شخص تھے۔ اور ایسے عالم دین تھے جن کے سینے میں دلِ دردمند اور فکر ارجمند تھی، وہ مخلوق خدا کی انواع واقسام کی پریشانیاں اور مشکلات دیکھ کر فکرمند ہوجاتے تھے، آپؒ ان کیلئے ایک شمع فروزاں اور تاریک راہ کے روشن دیا تھے، بالفاظ دیگر بیاباں کی اندھیری شب کے جگنو تھے، وہ جگنو جس کی ترجمانی شاعر اسلام علامہ اقبالؔ نے یوں کی ہے: ؎

اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل چمکا کے ہے دیا بنایا
ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے آتے ہیں جو کام دوسروں کے

مولانا مرنجا مرنج طبیعت اور علمی مذاق کے حامل تھے

حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی تحریر کرتے ہیں: ''حضرت مولانا مرنجا مرنج طبیعت اور علمی مذاق کے حامل تھے، انہوں نے صحت جہاں تک برداشت کرتی رہی تدریسی مشغولیت کو قائم رکھا، اس کے ساتھ ہمت اور بلند حوصلگی میں بھی بڑھے ہوئے اور مرض کی صعوبتوں کو سیر چشمی سے گوارا کرتے رہے اور اپنے کو صحت مند کی صورت میں ظاہر کرتے تھے، آخری دن تک گفتگو اور باتیں صحت مند شخص کی طرح کرتے رہے، حالانکہ اندر سے طبیعت خاصی ناساز تھی اور اس طرح وہ دوسروں کے لئے اچھی مثال چھوڑ کر گئے، علمی ذوق کے حامل ہونے کی وجہ سے علم کی راہ میں ان کی بڑی خدمات ہیں۔

مولانا اہل خاندان کی نظر میں

حدیث پاک میں ہے:"عن عائشة رضی اللّٰه عنها قالت قال رسول الله صلی اللّٰه علیه و سلم"خیرکم خیرکم لاهله" تم میں بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ بہتر ہو۔(رواہ ابن ماجہ)

اور دوسری حدیث میں ہے حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:" لأن یؤدب الرجل ولده خیر من أن یتصدق بصاع" ۔(رواہ الترمذی)

آدمی اپنے بچے کی صحیح تربیت کرے یہ ایک صاع صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔

ان دونوں حدیثوں کی روشنی میں اگر مرحوم کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم نے فرمان رسول پر عمل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں اٹھا رکھا، وہ اپنے خاندان میں کس قدر ہر دلعزیز و محبوب تھے، اس کا اندازہ بانگ حراء لکھنؤ کے خصوصی اشاعت (جنوری-فروری ٢٠١١) میں شامل مضامین سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

خصوصاان کی صاحبزادی کا مضمون جوان کی تربیت کا بہترین نمونہ ہے، اوران کے بھانجے ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی، اوران کے صاحبزادے ڈاکٹر سعید الرحمٰن فیضی کے تاثرات واحساسات پر مشتمل مضامین سے ان کی خانگی زندگی کے متنوع پہلو سامنے آئے ہیں جس سے ان کی شخصیت کی جامعیت وبوقلمونی کا اندازہ ہوتا ہے۔

بیٹی کے تأثرات

مرحوم کا انداز تربیت بڑا اچھوتا اور نرالا تھا، وہ اپنے متعلقین کو زجر وتوبیخ کے بغیر بات ہی بات میں شفقت ومحبت سے ایسی تربیت کرتے کہ وہ جزو زندگی بن جاتا، مولانا کی جگر گوشہ، دختر نیک اختر محترمہ رفعت محبوب اپنے والدمحترم کے انداز تربیت کے بارے میں لکھتی ہیں:

’’میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد کبھی ان کو فجر یا عشاء کی نماز گھر پر پڑھتے نہیں دیکھا، نماز باجماعت ادا کرنے کے عادی تھے، سخت سردی، گرمی بارش کچھ بھی ان کی جماعت کے راستے میں حائل نہ تھی، وقت کے بہت پابند تھے، اپنی بزرگی اور بڑائی بیان کرنا تو دور ہمیشہ سب سے دوستانہ رویہ رکھتے، ہم ہمارے بچے سبھی سے دوستانہ انداز میں باتیں کرتے اور باتوں ہی باتوں میں بچوں کی تربیت کا بہت انوکھا انداز تھا، آج جب ہم فرصت میں ان کو یاد کرتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ وہ باتوں ہی باتوں میں ہم سب کو بہت کچھ سکھا گئے، جو شاید لمبی چوڑی تقریر کرنے کے بعد ہم پر اثر انداز نہ ہوتی، بہت ہی عملی انسان تھے، خوابوں کی دنیا سے دور حقیقت پسند، ہم سبھی بھائی بہنوں کو انہوں نے جینے کا انداز الگ سکھایا، سب سے پہلے خود اعتمادی ایمانداری تب دنیا داری، اس لئے ہم سب بھائی بہن الحمد للہ اپنے گھروں میں خوش وخرم ہیں، بچوں کو آپس میں جوڑنا یہ کام بہت خوبصورتی سے کرتے، ایک بچے کو دوسرے سے قریب رکھنے کیلئے ڈھال بن جاتے،

رشتوں کو نبھانا تو ہم نے انہیں سے سیکھا، آج ہم اپنی اس مشفق ہستی سے بہت دور ہو گئے وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے اور ہم دنیا میں ان کی پاکیزہ شفقت سے محروم ہو گئے۔(۱)

بیٹے کے تأثرات

مرحوم کے لختِ جگر جو واقعۃً ''ولد صالح'' کے مصداق ہیں، مولانا سعید الرحمٰن فیضی ندوی اپنے والد محترم کے انداز تربیت اور طرز زندگی کے بارے میں رقم طراز ہیں: ''والد صاحب کو خدا نے اولاد کی تربیت کا بڑا ملکہ عطا کیا تھا، انہوں نے اپنی ساری اولاد کی تعلیم وتربیت کا بخوبی انتظام کیا، وہ خود کلکتہ میں رہا کرتے تھے لیکن ہر لمحہ اور ہر آن اولاد کی تعلیم وتربیت کی طرف سے فکرمند رہا کرتے تھے، ہم سب بھائی بہنوں پر ہر وقت نظر رکھتے تھے، خاص طور پر اخلاق وگفتار پر توجہ ہوتی، کوئی غلط بات دیکھتے تو شفقت ومحبت کے ساتھ تنبیہ فرماتے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی غیر موجودگی میں بھی کوئی غیر معقول بات کرتے ہوئے طبیعت جھجکتی اور برائی سے نفرت پیدا ہو جاتی۔

اور والد محترم کی ساری زندگی یقین محکم، عمل پیہم اور جہدِ مسلسل سے عبارت تھی، وہ اکثر اپنی مشہور کتاب '' دروس الأشياء والمحاورة العربية'' میں شامل نظم '' النمل'' کے اشعار گنگنایا کرتے تھے، غرض ان کی عملی زندگی اسی نظم کی تفسیر تھی۔

مولانا کی شخصیت ہمہ گیری وجامعیت کا حسین سنگم تھی، موصوف بے شمار خوبیوں وکمالات کے حامل تھے، وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، مولانا کی کن کن خوبیوں کو سپرد قرطاس کیا جائے، بقول شاعر ؎

سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے
ورق تمام ہوا مدح ابھی باقی ہے

(۱)(''میں اور میرے ابو چند یادیں'' رفعت محبوب صفحہ ۱۱)

مولانا رحمتہ اللہ علیہ کی پوری زندگی اسلام کی خدمت اور کتاب وسنت کی نشر واشاعت کے لئے وقف تھی، آپ نے دعوت اور تعلیم کے حوالے سے بہت سی قابل ذکر خدمات انجام دی۔

بعض علماء کے تأثرات

مولانا رضی انور لکھتے ہیں: ''آپ بڑے متواضع ومنکسر المزاج اور بڑے عالم وفاضل تھے، نہ صرف استاذ الاساتذہ بلکہ استاذ گر تھے۔ ندوی نہ تھے لیکن ندوی المزاج اور ندوی الفکر تھے، ندوی زادہ اور ندوی گر تھے، عربی داں ہی نہیں بلکہ عربی داں پیدا کرنے والے، عربی آموزی کے گر سے واقف تھے، اور یہ کیوں نہ ہو جب کہ آپ مدرسہ صولیتہ کے فارغ، جامع ازہر کے فاضل اور ہندوستان میں عربی زبان وادب کے بڑے ماہر اساتذہ میں تھے، اور اس میدان میں آپ کو بڑی مہارت وحذاقت اور عملی تجربہ حاصل تھا''۔

مولانا عبدالودود ندوی لکھتے ہیں: ''حضرت مولانا گونا گوں صفات وکمالات کے مالک تھے، اللہ تعالی نے آپ کو جرأت مندانہ اور اسلام کے لئے جوش وجذبہ عطا فرما رکھا تھا، ایک اور ندوی فاضل آپکے صفات وکمالات کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں ''مولانا مرحوم میں اللہ تعالی نے بہت سی خصوصیات جمع فرمائی تھیں، علم وعمل، خدا ترسی، صبر وثبات، جرأت واستقامت، حسن اخلاق، خوئے دلنوازی وظرافت طبع جیسی صفات ان میں جمع تھیں''۔

باب ششم

معاصرین حضرات

تمہید

معاصرین کا یہ باب ان حضرات کے سلسلہ میں قائم کیا گیا ہے جن سے حضرت مولانا محبوب الرحمٰن صاحب ازہری کے روابط وتعلقات تھے، جن کے ساتھ رفاقت اور درس وتدریس یا کسی اور مناسبت سے کوئی ربط وتعلق رہا، ویسے تو اللہ تعالی نے مولانا کو لمبی عمر عطا فرمائی تھی، اس لئے بہت سے معاصرین سے ان کی رفاقت رہی، مگر یہاں ان کے چند معاصرین کا تذکرہ کیا جاتا ہے، جن میں خاص طور سے حضرت مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، حضرت مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی، حضرت مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی اور بعد کے دور میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ہیں۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نوراللہ مرقدہ

آپ کے معاصرین میں ہم سب سے پہلے حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی نوراللہ مرقدہ کا ذکر کرتے ہیں:

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نوراللہ مرقدہ اس وقت بھی ندوۃ العلماء میں استاذ تھے، جب مولانا محبوب الرحمٰن صاحب ازہری ۱۹۴۲ء میں ازہر سے فارغ ہوکر آئے تھے، اس لئے سب سے زیادہ مشہور اور قدیم معاصر حضرت مولانا علی میاں ندوی تھے، مفکر اسلام کی پیدائش ۱۹۱۳ء میں ہوئی، اور ندوۃ العلماء میں تعلیم کی

تکمیل کی اور دارالعلوم دیوبند سے بھی استفادہ کیا، اور پھر لاہور میں مفسر قرآن حضرت مولانا احمد علی لاہوری سے تفسیر قرآن شریف پڑھی، پھر ندوۃ العلماء میں اپنی تدریسی خدمات انجام دیں، معتمد تعلیمات سے ہوتے ہوئے ناظم ندوۃ العلماء بنے اور آخر عمر تک اس منصب جلیل پر فائز رہے، تصنیف وتالیف میں ایک کتب خانہ عربی اور اردو میں چھوڑا، دنیا نے آپ کی امامت اور جلالت شان کا اعتراف کیا، آپ کی مفکرانہ اور مدبرانہ تحریر وخطابت کا لوہا مانا، مولانا محبوب الرحمٰن صاحب نے ندوۃ العلماء کے زمانہ میں بھی تعلق رکھا، پھر کلکتہ جانے کے بعد بھی رابطے میں رہے اور وہاں سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد تو حضرت مولانا علی میاں صاحب ندوی نے مولانا کو ندوہ کے لئے منتخب کرلیا اور آخر تک مولانا محبوب الرحمٰن ندوے کے نگران اعلی رہے، مفکر اسلام ۳۱؍دسمبر ۱۹۹۹ء میں واصل بحق ہوگئے، اللہ تعالی حضرت والا کے درجات بلند فرمائے۔

حضرت مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی

حضرت مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کی ولادت ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۹۳۵ء میں بہار میں ہوئی، ایک متبحر عالم دین اردو عربی کے شاعر وادیب اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے، دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فراغت کے بعد درس وتدریس میں مشغول ہوگئے، پھر ایک عرصے تک جامعہ ام القری مکہ مکرمہ میں ملازمت اختیار کی، اس کے بعد ندوۃ العلماء میں معتمد تعلیمات بنائے گئے، چھ ماہ ہندوستان میں قیام رہتا اور چھ ماہ مکہ مکرمہ میں، آپ کی بے شمار خصوصیات ہیں، مولانا محبوب الرحمٰن صاحب ازہری کی معاصرت رہی، ۱۴۲۶ھ مطابق ۲۰۰٦ء میں مکہ مکرمہ میں وصال ہوا، اللہ تعالی درجات بلند فرمائے۔

علامہ ابومحفوظ الکریم معصومی

کلکتہ کے قیام کے دوران مولانا محبوب الرحمٰن صاحب کا تعلق علامہ ابومحفوظ الکریم

معصومی سے ہوگیا، علامہ ابومحفوظ ۳۱/ جولائی ۱۹۳۱ء میں پیدا ہوئے، مدرسہ عالیہ میں دونوں نے علمی کاموں میں مشارکت کی، دونوں ایک دوسرے کے قدرداں رہے، علامہ ابومحفوظ نے علوم عربیہ خاص طور سے حدیث، تفسیر، تاریخ میں مہارت حاصل کی، آپ کو عربی کے علاوہ اردو، فارسی اور انگریزی میں بھی مہارت تامہ حاصل تھی، آپ کی زبردست دینی اور علمی خدمات ہیں، ۱۶/ جون ۲۰۰۹ء میں واصل بحق ہوگئے، اللہ تعالیٰ درجات بلند فرمائے۔ آمین

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کو آپ کی رفاقت ومعاصرت کا طویل عرصہ ملا، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی پیدائش ۶/ جمادی الاولی ۱۳۴۸ھ مطابق ۲/ اکتوبر ۱۹۲۹ء میں ہوئی، حضرت مولانا نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اپنی تعلیم کی تکمیل کی اور کچھ وقت دارالعلوم دیوبند میں بھی گزارا، آپ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نوراللہ مرقدہ کے بھانجے اور تربیت یافتہ شاگرد اور عزیز ہیں، ستر سال کی عمر تک مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے آپ کی تربیت کی اور ستر سال کی عمر میں اپنی عمر کے آخری سال میں آپ کو اجازت وخلافت سے نوازا، اور مفکر اسلام کی وفات کے بعد آپ کے جانشین اور ندوۃ العلماء کے ناظم اعلی اور مسلم پرسنل لاء بورڈ کے صدر اعلی بنائے گئے، حضرت مفکر اسلام کی طویل تربیت کی وجہ سے اس وقت سب سے زیادہ صاحب تاثیر مشائخ وبزرگوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے، مولانا محبوب الرحمٰن نے آخری وقت تک آپ سے تعلق رکھا، مولانا محبوب الرحمٰن کی وفات پر حضرت مولانا رابع صاحب نے اپنے تعلق کا اس طرح اظہار کیا۔

''مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے مجھے بھی خاصی موانست حاصل تھی، میں عملی طور پر ان کا

شاگرد تو نہ ہوسکا، لیکن ندوۃ العلماء میں تدریسی خدمات کے لحاظ سے مجھے معاصرت کا شرف حاصل ہوا، اور عربی زبان وادب سے مشترکہ دلچسپی کی بناء پر بھی ان سے قربت محسوس ہوتی تھی، اور اس قربت کو مجھ سے زیادہ وہ نباہتے تھے، یہ ان کی نرالی بات تھی، ان کی وفات کو میں نے خصوصی رنج کا واقعہ محسوس کیا، اور میرے دل میں ان کی برابر قدر ہے، ان کے صاحبزادگان سے میں بہت تعلق محسوس کرتا ہوں''۔

مولانا محبوب الرحمٰن ازہریؒ ہر خاص وعام کی نظر میں محبوب ومرغوب تھے، لوگ آپ سے والہانہ پیار اور اٹوٹ محبت کرتے تھے، آپؒ اپنے معاصرین وہم عصروں میں طویل عمر پانے والے ہوئے، اللہ نے آپ کو مقبولیت کے اعلیٰ مدارج تک پہنچایا، مولانا مرحومؒ کے صاحبزادے مولانا سعید الرحمٰن فیضی ندوی تحریر کرتے ہیں: ''والد مرحومؒ کے مدرسہ صولتیہ کے ساتھیوں کی ایک لمبی فہرست ہے، ان میں شیخ عبد القادر کرامت اللہ جو کہ والد صاحب کے اچھے دوست اور بڑے قدرداں تھے، پرہیزگار اور ذی علم انسان تھے، ایک اور اہم شخصیت جس نے مدرسہ صولتیہ سے فراغت کے بعد مصر سے فوجی ٹریننگ حاصل کی، میری مراد ہے عبد الغنی بن عبد القاسم بخاری، جن کی ساری تعلیم مدرسہ صولتیہ میں ہوئی اور دوستی میں ریاضی والد صاحب سے پڑھی، جس کا ذکر اکثر وہ بڑی بڑی مجلسوں ومحفلوں میں کیا کرتے تھے۔

مزید تحریر کرتے ہیں: ''والد صاحب نے مصر کا سفر کیا، جامع ازہر میں داخلہ لیا، جامع ازہر اس وقت عالم اسلام کی اہم درس گاہ شمار ہوتی تھی، وہاں کے تمام اساتذہ کرام سے والد صاحب کا بہت جلد گہرا تعلق ہوگیا تھا، بعض اساتذہ کرام کو والد صاحب کی عربی زبان وادب پر قدرت کی وجہ سے اور بعض کو والد صاحب کا قرآن تجوید سے پڑھنا بہت پسند تھا''۔

باب ہفتم

مولانا ازہری اپنی تحریروں کے آئینے میں

تمہید

مولانا ازہریؒ کی تحریری افکار کی صدا ''ہم دوش ثریا فلک بوس ہے نشیمن میرا''ہے، مولاناؒ نے مضامین بہت کم اور مختصر لکھے مگر جامع جو دریا بہ کوزہ کے مصداق ہیں۔اس میں ظرافت طبع، سادگی پسند اور سہل انداز''ہر کس و ناکس بسہولت پڑھ سکتا ہے''کو نرالے ڈھنگ سے اجاگر کیا اور ان چند مضامین و مقالات میں اردو سے زیادہ عربی کی طرف اشہب قلم رواں دواں ہے، جو بہت ہی پرکشش اور خوش اسلوب ہے،نوشتہ تحریر ایک اُداس زندگی میں امید کی کرن،گھٹاٹوپ تاریکی میں بجلی کی چمک،شب دیجور میں قندیل رہباں ہے اور ایسا لکھا! جیسے بلبل نغمہ زن ہو، کانوں میں رس گھول رہا ہو، جس سے لذت و سرود محسوس ہوتا ہے،اس سے بڑھ کر تحریر میں سحر سامری کا سا اثر دل و دماغ پر کرتا ہے اور نقش چھوڑتا ہے، پھر نجی زندگی کیلئے اسرار و رموز کے پیکار، کامیاب زیست کے سوز کا متفکر، بشر کے حالات و واقعات سے باخبر تھے، بالفاظ دیگر مرد بیمار کو رجال کار بنانے کی ہوس نے ٹکرے ٹکرے کر دیا تھا،الغرض آپ کا علم مثل انگوٹھی ہے تو قلم سازی اس کا نگینہ ہے، ایسا نگینہ جس کی چمک نسل نو کو حقائق حال سے واقف کر کے بقول جگر مرادآبادیؒ: ؎

خوابیدہ زندگی تھی جگا کر چلے گئے
ہر نقش ما سوا کو مٹا کر چلے گئے

کے مصداق ہوئے اور علمی دنیا میں قلمی شہرہ ہوا، شناور شخصیت تنا ور قلمی ہی سے ہے۔

شر کو خیر کے توسط سے کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے

مولانا مرحومؒ نے تحریر و تقریر، خطابت و کتابت کے ذریعہ سوز و گداز کا پرچم لئے باطل کے قلعوں میں چنگھاڑ تا مروت وانسانیت کا جھوٹا وفریب دہندہ لبادہ اتار کر محمد ﷺ کا لبادہ اوڑھا تھا اور عین صراط مستقیم کی راہ دکھا کر پیاسی رگوں کو جام و مشرب کا وہ انمول و قیمتی تحفہ دیا جس سے رگ جاں میں سکون وقرار نصیب ہوا، غلط روش پر گامزن افراد کو دعوت دی اور عقل و خرد کے بندھن کی عقدہ کشائی کی اور گرہ کھول دی، اخلاقیات کی برائی کو دور کیا، فتنہ وفساد میں گرفتار دل کو حریت و آزادی دلائی، نئے ایجادات واختراعات اس کی جڑ ہے، عوام الناس آلات جدیدہ کے استعمال کرنے کیلئے مسائل پوچھتے ہیں مشاغل کے پس پردہ فتویٰ لے کر بے دریغ فحش کاری میں ملوث رہتے ہیں، اس پر ایک بہت ہی پر اثر حالات حاضرہ کی روشنی میں ''ٹی وی، ویڈیو اور ''تبلیغ اسلام'' کے زیر عنوان مضمون تحریر کئے، اس میں حرکات وسکنات کے پلندے کھول دیئے، ایک اقتباس نذر قارئین کرام کیا جاتا ہے، مذکورہ بالا عنوان کے تحت مولاناؒ یوں تحریر کرتے ہیں ''شر کو خیر کے توسط سے کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے؟ اب بھی ٹی وی پر عربوں کو مقامی وعظ ونصیحت سے کہیں زیادہ مصری فلمیں اور ڈراموں کا شوق ہے بلکہ اب تو امریکی فلمیں ''جن میں فحش فلمیں بھی شامل ہیں'' ٹی وی پر دیکھی جاتی ہیں اور شب بیداری عام معمول ہوگئی ہے، مزید لکھتے ہیں:

''ہم خلوص کے ساتھ ایک کام کو شروع کرتے ہیں اور پھر اسکو شر کا ذریعہ بنا لیتے ہیں، مغرب نے میڈیا کے ذریعہ ہمارا مزاج ہی بدل دیا ہے اور اب دعوتی و دینی معلومات کے

کیسٹ کافی تیار ہونے کے باوجود ہمارے گھروں میں غناوسرود کے کیسٹوں کی اتنی بہتات ہے کہ افراد کواس سے فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ دعوتی کیسٹ سنیں اور اگر کسی بڑے بوڑھے نے ایسا کیسٹ لگا بھی دیا تو دوسرے اس کوفوراً بند کردیں گے کہ اس میں کچھ بھی مزہ نہیں ہے تو محض ویڈیو اور کیسٹ کے جواز کیلئے فتویٰ حاصل کرنا بے سود ہے جبکہ ذوق ہی بگڑا ہوا ہے''۔ (خصوصی شمارہ ص۱۳۶)

مولانا کی تحریر کا طرۂ امتیاز

مولانا مرحومؒ نے دینی، دعوتی، اصلاحی، تربیتی اور تعمیری خدمات انجام دی اور فکر امت کی کسک کا اظہار نجابت واصالت اور شرافت کے انداز سے کر کے درد وکرب کا رونا رویا ہے۔اور کردار سازی کا کام انجام دیا ہے اور خود کو ہر طرح سے ثابت بھی کر دیا کہ: ؎

تقریر سے ممکن نہ تحریر سے حاصل
وہ کام جو انسان کا کردار کرے ہے

سوز وساز زندگی کی کیفیت تحریر میں سیال ہے یہی نہیں ! بلکہ میں پورے وثوق سے کہتا ہوں شاعر اسلام علامہ اقبالؒ کی زبان میں: ع

زندگی مضمر ہے تیری شوخیٔ تحریر میں

اسلام کے دفاع میں قلمی جنگ کی اور علم وقلم کے ذریعہ اسلام پیروکار کی قلبی ترجمانی کی:''كُلُّ حِزْبٍ بِمَالَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ'' میں پلنے والے گروہوں کو'' ادخلوا فی السلم کافة'' کی صدا لگائی، منتشر کو مجتمع کر کے آواز دی''ان الدین عند الله الاسلام'' فرق ضالہ کی قلعی کھول کر حق گوئی وبیباکی مثال قائم کی، ازہریؒ کی تحریر کا یہ طرۂ امتیاز ہے۔

ماحصل یہ کہ مولانا ازہریؒ نے ہزارۂ سوم کے مسافروں کی قیادت وسیادت کی اور تحریر وطباعت اس کی شہادت دیتی ہے آپ کی پوری دعوت وارشاد، تگ ودو، دوڑ دھوپ کا

آہنگ اور پوری زندگی کا حاصل، نچوڑا ہوا لہو، قلم سے نکلے نقوش، صفحۂ قرطاس پر بکھرے ہوئے نوشتہ کا انگ انگ اسی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے، وہی جادۂ فکر وعمل تحریر سے ہویدا ہے، وہ ایسا آئینہ ہے جس میں تصویر خودی دیکھی جاسکتی ہے۔

اسلامی اخلاق کا ایک پیکر مجسم

مولانا علاء الدین ندوی صاحب استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھتے ہیں: ''تحریر کے آئینے میں کسی صاحبِ قلم کا مطالعہ دراصل اس کی ''شخصیت کی دریافت'' کا کام ہے، ہر شخصیت اپنے فکری زاویئے ،متنوع کمالات اور رنگا رنگ پہلوؤں سے عبارت ہوتی ہے، یہ تحریر وتقریر کے قالب میں جھلکتی ہے، اگر کہیں اس شخصیت کا تعلق ان نفوس قدسیہ کے سلسلۃ الذہب سے جڑا ہوا ہو جو اپنے وقت میں عظمت وکمال کے مینار بن کر کھڑے رہے ہوں، تو وہ فکری شخصیت اپنی تحریروں میں اس طرح چھپی ہوئی ہوتی ہے جیسے قیمتی معدنیات کے ڈھیر زمین کے خزانوں میں اور تحریر کے آئینے میں شخصیت کا عکس دکھانے کا عمل ویسا ہی ہوتا ہے جیسے زمین کی تہوں سے معدنیات کو باہر لانا اور قیمتی جواہرات کی شکل میں پیش کرنا۔

علامہ شبلی نعمانیؒ عالم کائنات کا سب سے مقدم فرض اور سب سے زیادہ مقدس خدمت یہ بتاتے ہیں: ''نفوس انسانی کے اخلاق وتربیت کی اصلاح وتکمیل کی جائے ......پھر تمام عالم میں ان کی عملی تعلیم رائج کی جائے، اس مقصد کے حصول کا عام طریقہ وعظ وپند ہے، اس سے زیادہ متمدن طریقہ یہ ہے کہ فن اخلاق میں اعلیٰ درجے کی کتابیں لکھ کر تمام ملک میں پھیلائی جائیں، ایک طریقہ یہ ہے کہ لوگوں سے بجبر محاسنِ اخلاق کی تعمیل کرائی جائے اور رذائل سے روکے جائیں ......لیکن سب سے زیادہ صحیح، سب سے زیادہ کامل، سب سے زیادہ عملی طریقہ یہ ہے کہ نہ زبان سے کچھ کہا جائے، نہ تحریری نقوش پیش کئے جائیں،

نہ جبر وزور سے کام کیا جائے، بلکہ فضائلِ اخلاق کا ایک پیکرِ مجسم سامنے آجائے، جو خود ہمہ تن آئینۂ عمل ہو، جس کی ہر جنبشِ لب ہزاروں تصنیفات کا کام دے اور جس کا ایک اشارہ اوامرِ سلطانی بن جائے، دنیا میں آج اخلاق کا جو سرمایہ ہے سب انہیں نفوس قدسیہ کا پرتو ہے، دیگر اور اسباب صرف ایوانِ تمدن کے نقش ونگار ہیں۔

مولانا ازہریؒ جن کی تحریر کے آئینے میں ان کی شخصیت کی مختلف جھلکیاں دیکھنے کی کوشش کی جارہی ہے، ان کا ایک اشارہ چاہے اوامر سلطانی نہ بنا ہو، تاہم اتنا ضرور ہوا کہ وہ اسلامی اخلاق کا ایک پیکرِ مجسم بن کر سامنے آئے اور ہمہ تن خود آئینۂ عمل بن گئے، اسی پیکرِ مجسم اور آئینۂ عمل کو ان کے مختصر تحریری نقوش میں دیکھنے کی ان سطور میں سعی کی گئی ہے۔

سوانح نگاری کانمونہ

''ایک قدیم ترین ندوی اور قرآن کریم کی خدمت مولانا فضل الرحمان صاحبؒ'' کے عنوان سے مولانا محبوب الرحمٰن ازہریؒ کا یہ مضمون جو اندازاً پانچ ہزار الفاظ پر مشتمل ہوگا، پندرہ روزہ ''تعمیر حیات'' کے ۱۰/اور ۲۵/اگست کے شمارے میں شائع ہوا ہے، مولانا فضل الرحمٰن ندوی مجددیؒ فاضل مضمون نگار کے والد ماجد ہیں، فرزند ارجمند نے اپنے والد کی حیات اور دینی واصلاحی خدمات کا تعارف کرایا ہے، اس مضمون میں موصوف نے اپنے خانوادے کا قرآن کریم سے شغف، مسجد کی آبادکاری سے تعلق، تحریک ندوۃ العلماء اور دبستانِ شبلی سے وابستگی کو خاص طور سے اجاگر کیا ہے۔

یہ تحریر سوانح نگاری کا ایک شاہکار نمونہ ہے، اس میں واقعیت بھی ہے اور حقیقت نفس الامری پر اصرار بھی، اس میں مقصدیت بھی ہے اور واضحیت بھی، اس میں متانت بھی ہے اور تاثراتی اسلوب بیان بھی، بے ساختگی بھی ہے اور دلآویزی بھی، جس کی وضاحت آگے مثالوں کے ساتھ کی جائے گی، بیسویں صدی کے معروف سوانح نگار، متبحر عالمِ دین، مفکر

اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے سوانح نگاری کے چند شرائط ذکر فرمائے ہیں:

۱۔ پہلی شرط یہ ہے کہ سوانح نگار جس شخصیت کا تذکرہ کرے اس کی پوری زندگی کے اچھے برے پہلوؤں سے واقف ہو اور ان میں امتیاز کی صلاحیت رکھتا ہو۔

۲۔ دوسری شرط یہ ہے کہ سوانح نگار کے اندر صاحبِ سوانح کی خصوصیات اور اس کی زندگی کی گہرائیوں میں اتر جانے کا بے پناہ شوق ہو۔

۳۔ تیسری شرط یہ ہے کہ سوانح نگار زبان و بیان کے مزاج سے آگاہ ہو اور اپنے معنی و مفہوم کو ادا کرنے کے لئے موزوں ترین الفاظ پر قدرت رکھتا ہو۔

۴۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ امانت دار، ذمہ دار اور حقیقت شناس ہو، اور بقول مولانا حالی: ''بیوگرافی (Biography) ان بزرگوں کی ایک لازوال یادگار ہے جنہوں نے اپنی نمایاں کوششوں سے دنیا میں کمالات اور نیکیاں پھیلائی ہیں''۔

مولانا کی زیر بحث تحریر ان شرائط اور معیارات پر کلی طور پر منطبق ہوتی ہے، مولانا اپنے سوانح نگار کی زندگی کے پہلوؤں سے واقف ہیں، اس کی خصوصیات اور کمالات کی صحیح معرفت رکھتے ہیں، اظہار بیان میں سلاست و بے ساختگی ہے، ایک ذمہ دار، حقیقت شناس اور امانت دار انسان ہیں، وہ اپنے صاحبِ سوانح کے کمالات وخصوصیات بیان کر کے قاری کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ ''تم پڑھتے جاؤ اور ایسے ہی کام کا داعیہ اپنے اندر پیدا کرو''۔

مولانا نے اپنے والد ماجد کی سوانح لکھی ہے، وہ چاہتے تو دوسرے سوانح نگاروں کی طرح سراپا عقیدت وتقدس سے ایک مبالغہ آمیز بایوگرافی تیار کرتے، ان کے کمالات وخصوصیات پر احوال وکمالات کا رنگ چڑھا دیتے اور ان کے مناقب وفضائل کا ایک گلدستہ سجاتے، مگر ایسا کرنا تاریخیت اور صداقت کو مسخ کرنا ہوتا اور مولانا جیسا دیانت دار انسان یہ کام نہیں کرسکتا تھا، اس لئے انہوں نے اپنے والد کے تذکرے کو عقل وشعور کے

معیار پر ہی رکھا، انہوں نے تاریخی صداقت کا التزام کیا ہے اور اپنی صاف ستھری تحریر کے آئینے پر ایک اچھے، سچے، نیک، خدا ترس، خدا آگاہ اور صاحبِ فضل وکمال شخصیت کا ایسا عکس دکھایا ہے جو ہمارے معاشرے کا چلتا پھرتا زندہ پیکر محسوس ہوتا ہے ۔

تاریخ نویسی

ایک زمانے تک سوانح نگاری اور تاریخ نویسی کو ایک ہی فن سمجھا جاتا تھا، مگر دونوں الگ الگ چیزیں ہیں، سوانح نگاری کسی پسندیدہ شخصیت کی رودادِ حیات ہوتی ہے، مگر تاریخ تو مجموعۂ اشخاص اور اقوام وملل کے عروج وزوال کی داستان ہوا کرتی ہے، سوانح نگاری میں ایک شخص کی تاریخ ہوتی ہے جس میں تاریخی مواد ہوسکتا ہے، مگر تاریخ تو شخص واحد کی سوانح حیات کا نام نہیں ہے۔

مولانا ازہریؒ نے اپنی تحریر کے ذخیرہ میں تاریخی عناصر کے حامل متعدد وقیمتی مضامین چھوڑے ہیں، مثلاً:

(۱) انگریزی عہد کا ایک دینی مدرسہ عالیہ کلکتہ ۱۷۸۱ء سے ۱۹۵۴ء تک

(۲) عبورِ قلزم یا نیل؟

(۳) شیعیت خود اپنے آئینہ میں

اول الذکر مضمون ''البلاغ'' کے دسمبر ۱۹۵۴ء اور جنوری فروری ۱۹۵۵ء کے شماروں میں شائع ہوا ہے، دوسرا مضمون ان کی حیات تک غیر مطبوعہ رہا، پہلی بار ''بانگ حرا'' کے خصوصی شمارے (جو مولانا ازہریؒ ہی کی حیات وخدمات کے تذکرے پر مشتمل ہے) میں شائع ہوا، جبکہ تیسرا مضمون ''تدریب الامۃ والدعاۃ'' ندوۃ العلماء کے پروگرام مورخہ ۲؍جولائی ۱۹۸۷ء کو پیش کیا گیا، جو ''تعمیر حیات'' کے ۱۰؍اور ۲۵؍نومبر ۱۹۸۷ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

مولانا کے ان مضامین کی اساس تاریخی صداقت کے التزام اور صحت واستناد پر ہے، جس کے اظہار میں حقیقت بیانی اور موضوعیت سے کام لیا گیا ہے ''مدرسہ عالیہ'' کے تذکرے میں محاسن کی ''ردشیعیت......'' میں معائب کی اور ''عبور قلزم یا نیل؟'' میں موضوعی بحث وتحقیق کی سچی تصویر نظر آتی ہے، مولانا جذباتی انشاء پرداز نہیں کہ حقائق پر رنگ آمیزی کا خراد چڑھائیں اور مبالغہ آرائی سے کام لے کر واقعات کو افسانہ بنا ڈالیں، وہ قلم کاری کے زور سے ساحرانہ اسلوب ترتیب نہیں دیتے، بلکہ وہ سپاٹ وسادہ کردار نگاری میں فطری اثر ودلآویزی پیدا کرتے ہیں، ایک مورخ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ انسانی سرگرمیوں، انسانی عروج وزوال اور بڑے کارنامے انجام دینے والی انقلابی اور مردم ساز شخصیتوں کے کاموں کو پوری صداقت ودیانت کے ساتھ پیش کردے اور مولانا ازہریؒ نے اپنی وقیع تحریر میں یہی کام کیا ہے، مولانا نے لارڈ ہسٹینگس کی خدمات کو جس دیانت داری سے اجاگر کیا ہے وہ تجرید اور موضوعیت کی شاہکار مثال ہے۔

تبصرہ وتنقید

اس ضمن میں مولانا کی متعدد تحریروں کے آئینے میں ان کی علمی بلندی، تنقیدی معیار اور اسلوب ولہجہ کی شائستگی کا عکس دیکھا جاسکتا ہے، یہ مضامین حسب ذیل ہیں:

''بیان اللسان'' پر ریویو۔ ''عبرت آموز'' ۔اور'' بھاجپا سے ارتباط'' نیز'' قادیانیوں سے متعلق ایک اہم خط''۔ اپنی حقیقت وماہیت کے اعتبار سے یہ تنقیدی مضامین کے خانے میں رکھے جاسکتے ہیں، مگر آخر الذکر کا تذکرہ ہم دفاع اسلام کے عنوان سے کریں گے۔

قاضی زین العابدین میرٹھی (م ۱۴۱۱ھ) کی تیار کردہ عربی اردو ڈکشنری طبع ہوکر منظر عام پر آئی، تو مولانا نے اس پر بھرپور علمی تنقید اور تبصرہ فرمایا، جو ماہنامہ ''برہان'' دہلی، ستمبر

۱۹۵۰ء میں شائع ہوا، اس وقیع مضمون میں مولانا نے مذکر مونث، واحد جمع، دخیل اور بازاری الفاظ کو جدید الفاظ سمجھنا، غلط ترجمے، بعض الفاظ کے جنسی معانی کی جانب ضرورت سے زیادہ توجہ جیسے امور پر بھرپور تبصرہ کیا ہے۔

''عبرت آموز'' کا پس منظر یہ ہے کہ مولانا ازہریؒ ۱۹ستمبر ۱۹۹۲ء کے ''قومی آواز'' کے پہلے صفحہ پر نائب صدر جمہوریہ ہدایت اللہ کے انتقال اور اس کی وصیت کے مطابق شمشان گھاٹ میں جسد خاکی کو نذر آتش کئے جانے کی خبر پڑھتے ہیں اور سکتے میں آجاتے ہیں، اپنے اندر ٹیس اور درد محسوس کرتے ہیں اور یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ عصری لادینی تعلیم اور اسلامی ماحول سے محرومی انسان کو کہاں لے جاکر پھینک دیتی ہے، مولانا اس مضمون میں اعلیٰ سند یافتہ اور غیر دینی تربیت پائے ہوئے لوگوں پر خون کے آنسو بہاتے ہیں، ان کے رویۂ زندگی پر درد وکسک کا اظہار کرتے ہیں، عبرت آموزی کے لئے ٹیگور کی اپنی ماں کی اطاعت شعاری کا واقعہ بیان کرتے ہیں، مسلمانوں کے لئے دینی تعلیم وتربیت کے لئے مدارس ومکاتب کی اہمیت کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور خدا کے حضور شکر وسپاس بجالاتے ہیں کہ خدا نے ہمیں اتنا دینی ذوق تو بخشا ہے کہ ہم اس قسم کے واقعات کو نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں، یوں پورا مضمون غفلت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بھیانک بیماری پہ ایک دردمند عالمِ دین کا اظہارِ افسوس بھی ہے، ایک ماہر حکیم کی طرح بیماری کی تشخیص بھی ہے، ایک کامیاب معالج کی طرح علاج کی سمت توجہ بھی ہے، عبرت آموزی کی خاطر مریض کے لئے مخلصانہ سبق بھی ہے، حیرت ہوتی ہے مولانا ازہریؒ نے صرف ایک صفحہ کے مختصر مضمون میں علم کا یہ موتی لٹایا ہے اور عبرت کا سبق لوگوں کو پڑھایا ہے۔

''بھاجپا سے ارتباط'' نامی مضمون دراصل ایک مراسلہ ہے جو سید حامد صاحب کے کسی ایسے مضمون کے جواب میں لکھا گیا ہے جس میں انہوں نے اقلیت (خاص طور سے مسلمانوں) کو تعلیم، صحت، اور تنظیم کے اپنانے کی تلقین کی تھی اور تنظیم سے مراد ''بھاجپا''

تھی جیسا کہ مولانا ازہریؒ نے لکھا: ’’میں سید صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ابتداء میں ہی ظاہر کر دیا کہ انہوں نے ’’بھاجپائی فکر‘‘ کو اپنایا ہے، ورنہ ان کی تحریر سمجھنے میں دشواری پیش آتی۔

یہ اپنے مقصد میں ایک کامیاب مراسلہ نگاری کا نمونہ ہے، اقلیت واکثریت کے مسئلہ میں مراسلہ نگار سب سے پہلے مصر کا واقعہ یاد دلاتے ہیں کہ جب وہاں اکثریت واقلیت کا مسئلہ اٹھا تو فوراً ہی اس پر قابو پالیا گیا، جب وزیراعظم محمود پاشا نے نقرئی پاشا اقلیت (قبطیوں) کے نمائندے سے کہا: آپ جو مراعات اور حقوق چاہتے ہوں انہیں تحریر میں قلم بند کر لیجئے، اس پر فریقین کے دستخط ہو جائیں گے، نقرئی پاشا نے ایک تحریر قلم بند کر لی، پھر دستخط کی میز پر انہوں نے وزیراعظم سے پوچھا کہ آپ ہم کو کیا حقوق دینا چاہتے ہیں؟ اس کے جواب میں محمود پاشا نے کہا: ہم آپ کو ۴۰ رفیصد سے زیادہ حقوق دینا چاہتے ہیں (یہ خیال رہے کہ قبطیوں کی تعداد ۱۰ فیصد تھی) نقرئی پاشا نے فوراً اپنی تحریر پھاڑ دی اور ردی کی ٹوکری میں ڈال کر کہا: ہم کتنا ہی زیادہ مطالبہ کریں گے اس حد کو نہیں پہنچ سکتے، ہم سادے کاغذ پر دستخط کرنے کے لئے تیار ہیں، اس طرح مصر میں اکثر واقلیت کا مسئلہ جڑ سے ختم ہو گیا، اس کے بعد مثالیں دے کر تعلیم وصحت کی بابت مولانا نے جو حقائق بیان کئے ہیں کہ کس طرح ہندوستانی مسلمانوں کیساتھ امتیاز برتا جاتا ہے، انداز بیان لطیف طنز وتعریض کی غمازی کرتا ہے اور سید حامد صاحب کے اس کوتاہانہ رویہ کی جانب جو اُن کے آئی اے ایس افسری اور وائس چانسلری کے زمانے میں ظاہر ہوا مثبت توجہ دلائی ہے۔

’’رد قادیانیت‘‘ اور ’’شیعیت اپنے آئینے میں‘‘ کے اندر تنقیدی پہلو بھی ہے، تاریخیت بھی، صداقت اور واقعیت بھی، غیرتِ ایمانی اور جرأت کا اظہار بھی، مگر اس کا تذکرہ ذرا دیر بعد۔

علمی نکتہ سنجی

مولانا ازہریؒ نے مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے بعد جامع ازہر کے دریائے علوم میں شناوری کی تھی اور اپنی پایابی کے جوہر کو خوب جلا بخشی تھی ،گلستانِ علم سے گل چینی کرتے ہوئے جتنا عمیق تجربہ اورخوشبوئے علم سے اپنے مشامِ جاں کومعطر کرنے کا جتنا طویل موقع آپ کوملا کم لوگوں کو اتنا موقع ملا کرتا ہے،نتیجہ یہ ہوا کہ مسلسل علم کی طلب وجستجو نے ان کو دقیقہ سنج عالم اورنکتہ رس فقیہ بنادیا،ان کی علمی دقیقہ سنجی کی منہ بولتی مثال ''جلیلیہ مسلم اسکول مدرسہ کے مونوگرام کے اشارات وتشبیہات'' نامی مضمون ہے،جوجلیلیہ مسلم گرلز کالج کے سالانہ میگزین میں شائع ہواہے،آپ کی گوہرافشانی ملاحظہ ہو:

حدیث رسول: گول دائرہ کے مونوگرام میں سب سے اوپر طلب العلم فریضۃ کا ٹکرا نظر آتا ہے،اس کے متعلق فرماتے ہیں:''اس جملہ سے معلوم ہوا کہ پیغمبر اسلام کے نزدیک علم کی کتنی اہمیت ہےاورایسا کیوں نہ ہوکہ پہلا حکمِ خداوندی پڑھنے کا تھا''۔

شمع: مونوگرام کے زیریں حصہ میں شمع جل رہی ہے،اس شمع کا آدھا حصہ پھیلی ہوئی کتاب کے کھلے صفحہ پرنظر آرہا ہے،اس شمع سے کرنیں پھوٹ رہی ہیں اور پورے مونو گرام کومنور کررہی ہیں،مولانا فرماتے ہیں:

''علم کی مثال شمع سے دی جاتی ہے، پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:علم روشنی ہے،گویا جس کے پاس علم ہےاس کے پاس روشنی ہے،جس کے پاس روشنی ہوتی ہے وہ خودبھی راستے کی ٹھوکروں سے محفوظ رہتا ہےاورصحیح راستے پر چل کرمنزل مقصودتک پہنچ جاتاہے، نیز دوسروں کوبھی گمراہی سے بچالیتاہے''۔

ستارہ:بکھری ہوئی روشنی کےگرداب میں دائیں جانب ایک ستارہ ہے،جس کی بابت مولانا یوں نکتہ سنجی فرماتے ہیں:''انسان جب علم وہنر سے اپنے آپ کوآراستہ کرلیتا ہےتو

آسمانِ علم پر ایسا چمکتا ہے، جیسا ستارہ، لوگ اس کی خوبصورتی اور اس کے حسن کو دیکھ کر اس پر رشک کرتے ہیں اور شب کے مسافران ستاروں سے صحیح رخ پاتے ہیں۔"

چاند: شمع، کتابِ الٰہی اور روشنی کی کرنیں سب کشتی نما چاند کی گود میں دکھائے گئے ہیں، اس چاند کی بابت مولانا کہتے ہیں: "چاند کی روشنی اپنی نہیں ہے بلکہ وہ سورج کی گرم روشنی کو اپنے اندر جذب کر کے سارے عالم کو ٹھنڈی روشنی بہم پہنچاتا ہے، یہی حال انسان کا ہے، وہ علم کے آفتاب سے روشنی حاصل کرتا ہے، زمین پر چاند کی طرح چمکنے لگتا ہے، پھر اپنی ذات سے چاند کی ٹھنڈی اور پر کشش روشنی کی طرح لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے"۔

کتاب: "کتاب سے مراد قرآن کریم ہے جو ہدایت کا سرچشمہ ہے، انسان کو اس کتاب سے اپنا تعلق مضبوط کرنا ہوگا......اسے پڑھنے اور سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کا عہد کرنا ہوگا، تبھی ہم اس دنیا میں سرخرو، کامیاب، بامراد اور سر بلند ہوں گے اور حقیقی علم کے علمبردار ہوں گے"۔

دفاع اسلام

دفاعِ اسلام مولانا ازہریؒ کی کتاب زندگی کا ایک درخشاں باب ہے، ملی غیرت، دینی حمیت، کتاب وسنت سے محبت اور دعوت واصلاح کے دردمندانہ جذبہ نے انہیں ہر اس منفی کوشش بلکہ سازش کے خلاف میدان فکر وعمل میں لا کھڑا کیا، جو اسلام کو سبوتاژ کرنا چاہتی ہے، مولانا اُکھاڑ پچھاڑ اور رزم وپیکار کے آدمی نہ تھے، وہ آتشیں جذبات سے بھی کام نہ لیتے تھے، حریف کو للکارتے بھی نہ تھے، مولانا دھیمی چال چلتے تھے، دھیمی زبان میں باتیں کرتے تھے اور اپنی حلیمی اور کلام نرم ونازک سے سخت جاں حریف کے دل کو زیر کر لیتے تھے، ان کی زبان میں لطافت اور حلاوت تھی اور اسی سے وہ دشمن کو مسحور ومسخر کرتے تھے، حریف کے مقابلے میں وہ میدانِ مناظرہ میں بھی اترے مگر وہ غیظ وغضب میں آپے

سے باہر نہ ہوئے، انہوں نے آستینیں بھی نہیں چڑھائیں، حریف پر حقارت کی نگاہ بھی نہیں ڈالی، حد یہ کہ مدمقابل کو زیر کرنے کے لئے اس کے سامنے اپنے دلائل و براہین کا انبار بھی نہیں لگایا، بلکہ اسی کے ہتھیار سے اس کو مات دی اور کلامِ نرم ونازک کی پتی سے ہیرے کا جگر کاٹا۔

''قادیانیت سے متعلق ایک خط'' اور ''سفر قادیان'' کو لیجئے، قادیانیوں کے خلاف اول فول بکنا کیا معنیٰ! مولانا تو شریفانہ اطوار اور شریفانہ زبان کی انتہا کر دیتے ہیں، دراصل مولانا دعوت کے اس حکیمانہ اسلوب پر ہمیشہ کاربند رہتے ہیں کہ شیریں زبانی اور حلیمی سے مدمقابل کے قلب پر دستک دے کر حق وصداقت کی روشنی پہنچائی جاسکتی ہے، یہ خط شفیع اللہ نامی شخص جو بنگلور، کرناٹک میں قادیانی جماعت کا امیر ہے، کے نام ہے، ذرا لہجے کی نرمی، اور نرم گداز اندازِ تخاطب ملاحظہ ہو: ''جناب محمد شفیع اللہ صاحب امیر احمدیہ جماعت کرناٹک اسٹیٹ بنگلور'' دعوت کا یہ حکیمانہ وشریفانہ طریقہ ہمیں فرعون کے مقابلے میں موسیٰ وہارون علیہما السلام کے ربانی طرزِ عمل کی یاد دلاتا ہے، جب ان کے رب نے ان سے فرمایا تھا: ''اذهبا الى فرعون انه طغى فقولا له قولا لينا لعله يتذكر أو يخشى''۔ (طہ:۴۳،۴۴)

مولانا رد قادیانیت وشیعیت کا فریضہ انجام دیتے ہوئے اپنے علمی ومنطقی دلائل کو سامنے نہیں لاتے، بلکہ خود حریف کے ہتھیار سے اس کی کاٹ کرتے ہیں، حریف کے احمقانہ رویوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور اس کے عقیدہ اور فکر وعمل کے تضادات دکھاتے ہیں، دو صفحات پر مشتمل اس خط میں مولانا نے دسیوں تضادات اور شریعت کے خلاف طرز عمل اپنانے کی مثالیں دے کر فریق مخالف کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے، مولانا کی اپنی خود اعتمادی ملاحظہ ہو:

''مرزا جی کی تمام تصنیفات پڑھنے کے بعد مجھے کہیں نہیں ملا کہ مرزا جی نے حج ادا کیا

ہواور ماہِ رمضان کے روزے رکھے ہوں''۔

''مرزاجی کی کتابوں میں مال کی ملکیت کا دعویٰ بار بار ہے، لیکن کہیں بھی ایک پیسہ زکوٰۃ وصدقات دینے کا ذکر نہیں، ہاں صدقات وصول کرنے کا ذکر ہے''۔

''مرزا بشیر الدین خلیفہ دوم کا ارشاد ہے: ''فاضل کی جماعت مفضول کے پیچھے نہیں ہوتی'' اس طرح مرزاجی کی تمام نمازیں جو انہوں نے دوسروں کے پیچھے پڑھیں نہیں ہوئیں''۔

''مرزاجی حیات عیسیٰ کو مستبعد قرار دیتے ہیں، کہ اتنی مدت تک کوئی زندہ نہیں رہ سکتا، جبکہ حضرت موسیٰ کی زندگی کے قائل ہیں اور اس بات پر ایمان لانا فرض قرار دیتے ہیں''، (نور الحق ص ۵۱) جواب مرزاجی دے سکتے ہیں کہ دو ہزار سال زندہ رہنا محال اور تین ہزار سال زندہ رہنے پر ایمان فرض ہے''۔

مرزاجی نے کہا: ''ہیضہ سے مرنا لعنتی موت ہے''۔ (حیات ناصر ص ۱۴) ''جبکہ ہیضہ ہی کی وبا سے مرزا کی موت ہوئی''۔

یہ اور اس طرح کی تمام متضاد باتوں کو مولانا ازہریؒ نے انہیں کی عبارتوں میں پیش کر کے ان کی حماقت، جہالت اور نادانی کو الم نشرح کیا ہے۔

''شیعیت خود اپنے آئینے میں'' میں ان کا اندازِ پیش کش مورخانہ ہے، مزاج داعیانہ ہے، اسلوب مشفقانہ وناصحانہ ہے اور اس کا تانا بانا محققانہ ہے، مولانا ازہریؒ اصلاح اور حکمت وموعظت اور جدالِ احسن پر کاربند رہتے ہیں، حد یہ کہ جدالِ احسن میں بھی وہ سوز دروں سے کام لیتے ہیں تاکہ مدعو کا دل قبول حق کے لئے وا ہو جائے۔

اصلاح امت

مولانا ازہریؒ زندگی بھر تعلیم کی شمعیں روشن کرتے رہے، آپ علم برائے تعلیم کے قائل

نہ تھے، بلکہ علم برائے اصلاح وہدایت اور تعمیر انسانیت آپ کا مشن تھا، ایک معلم ومربی ومصلح کے لئے تنہا یہ بات بڑے فخر کی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم معلمِ انسانیت بنا کر بھیجے گئے تھے اور یہی آپ کی ساری تحریروں کا بنیادی محور رہا، تعلیم، تربیت اور اصلاحِ امت میں آپ کی زندگی گزری، مگر ''ٹی وی ویڈیو اور تبلیغ اسلام''۔ ''سرپرست کے قلم سے'' اور ''مسجد اور مسلمان حقائق اور ذمہ داریاں'' میں آپ کی شخصیت ایک دردمند معلم، ایک مخلص مربی اور ایک حکیم ودانا مصلح کی حیثیت سے نمایاں ہے، حالات پر آپ کی گہری نظر رہا کرتی تھی، امراض سے واقف تھے، لہٰذا اُن کا علاج تجویز کرتے اور طریقۂ علاج سے فائدہ اٹھانے کے لئے غفلت کا پردہ چاک کرتے اور عوام کو بیدار کرتے۔

مولانا کی نگاہ میں ذرائع ابلاغ میں الکٹرانک میڈیا کی اہمیت بہت زیادہ ہے، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ اسلامی معاشرے کی رگوں میں آوارگی اور بداخلاقی کا جوزہر سرایت کر گیا ہے اس کا ذریعہ بھی میڈیا ہی ہے، مولانا سعودیہ کے شاہ عبدالعزیزؒ کے عہد کی مثال دیتے ہیں کہ وہاں ریڈیو اور فوٹو گراف رکھنا بھی جرم تھا، پھر آلات ووسائل پر نیکی کا مارکہ لگایا گیا اور انہیں درآمد کر لیا گیا، پھر نیکی تو پیچھے رہ گئی اور آلات وسائل سے لوگوں نے بدی کی تسکین کا سامان کر لیا۔ مولانا کے اندازِ بیان کی حلاوت دیکھئے اور حجاز میں ریڈیو کی درآمد کا پس منظر ملاحظہ فرمائے۔

''مصر سے قرأت نشر ہو رہی تھی، شاہ عبدالعزیزؒ کے برابر والے کمرے میں ریڈیو کھول دیا گیا، تلاوت کی آواز پر فوراً شاہ دوزانو ہو گئے اور استغراق کے ساتھ سننے لگے، یعنی وہ "اذا قری القرآن فاستمعوا له وانصتوا" پر عمل پیرا ہو گئے، پوچھا کون قاری ہے؟ اس کو ہمارے سامنے لاؤ، لوگوں نے معذرت کی کہ یہ یہاں نہیں مصر میں ہیں، ان کا شوق دیکھ کر بتایا گیا کہ یہ ایک آلہ ہے جو دور کی آواز کو دوسرے علاقوں میں پہنچاتا ہے، شاہ نے کہا: ایسا آلہ تو ہمارے یہاں ہونا چاہئے، اس کو منگوایا جائے، لوگوں نے کہا: اس کی

جازت نہیں ہے،شاہ نے جوش میں کہا: اسے کون روک سکتا ہے!اور درآمد کئے جانے کے احکام جاری کردیئے۔اب کیا تھا کھلم کھلا ریڈیو آنے لگے اور حجازیوں کا ذوقِ شعر ونغمہ سیر ہونے لگا''۔

مولانا نے اپنے محلے کے مسلمانوں کی تہذیبی شناخت کی بقاء اور تعلیم کے فروغ کے لئے''مدرسہ جلیلیہ......'' کی سرپرستی فرمائی،لڑکیوں کی تعلیم کے حوالے سے فرماتے ہیں:

''ہمارے یہاں آج بھی لڑکیوں میں تعلیمی رجحان کم ہے،جس کا بنیادی سبب ماضی میں ہماری بے حسی کا شاخسانہ ہے،وہ تو سرسید علیہ الرحمہ کی علی گڑھ تحریک نے تازیانہ کا کام کیا کہ ملت اسلامیہ ہندیہ حصار جمود وتعطل سے باہر نکل کر کارزارِ زندگی میں پا بہ رکاب ہوگئی۔

اس چھوٹی سے عبارت میں مولانا نے بیماری کی توجیہ بھی کردی،کامیاب معالج کی ستائش بھی کردی اور خوش کن نتائج پر اپنی مسرت کا اظہار بھی کردیا۔

''مسجد اور مسلمان......'' میں تو مولانا ازہریؒ نے اسلام کے کردار کو مسجد کے حوالے سے اس جامعیت کے ساتھ بیان کردیا ہے کہ سچ مچ دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کہاوت صادق آگئی ہے،اس جامع مضمون میں مولانا نے مسجد نبوی کی بناء وتعمیر،مسجد کی غرض وغایت،مسجد کا احترام اور اس کے تحفظ اور آبادکاری کے علاوہ،مسجد کی مندرجہ ذیل حیثیتیں بیان کی ہیں،وہ عمومی اجتماعی عبادت گاہ ہے،وہ تعلیمی مرکز ہے،وہ عدالت عالیہ ہے،وہ فوجی ہیڈکوارٹر ہے،وہ مجلس شوریٰ یا پارلیامنٹ ہے، وہ صدارتی محل ہے، وہ صلح ومعاہدات کا مرکز ہے وغیرہ۔

اچھی نثر کی خصوصیات

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اچھی زبان اور اچھی نثر کی کچھ خصوصیات بتائی ہیں کہ

''اچھی نثر وہ ہے جو براہ راست اور بے کم وکاست سوچنے اور اظہارِ مطالب کا وسیلہ ہو، جو کچھ بیان کیا گیا ہو وہ کانٹے پر نپا تلا ہو، جتنے اور جو الفاظ آئے ہوں وہی اور اتنے ہی معنیٰ ہوں، نہ کم نہ بیش، ٹھنڈے دل سے سارے نشیب وفراز پر نظر رکھ کر لکھی گئی ہو...... بے ساختہ ہو، شعر وشاعری کی مانند نہ ہو، زبان کو مقصد کا پابند بنایا گیا ہو''۔

مولانا کی تحریر (نثر) ان ساری خصوصیات کو عموماً سموئے ہوئے ہوتی ہے۔

مقصدیت

مولانا کی تحریر میں اول تا آخر مقصدیت کا رچاؤ ہوتا ہے، کیونکہ وہ زندگی کا ایک واضح شعور رکھتے ہیں اور انہیں اسلام کی حقانیت وابدیت پر کامل یقین ہے، اس لئے جو بات کہتے ہیں وہ مضبوط بنیاد اور مکمل اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں، اسی لئے ان کی تحریروں میں وثوق کا رنگ حاوی ہوتا ہے، یہی وثوق قاری کو اعتماد میں لیتا ہے، ''مسجد اور مسلمان......'' نامی اپنے وقیع مضمون کے اختتام پر مقصدیت کا اظہار یوں فرماتے ہیں۔

''مسلمانوں کو اپنا محاسبہ کرنا چاہئے کہ مسجد کی تعمیر اور آبادکاری، تحفظ اور بقاء، پاکی اور صفائی میں کتنی ذمہ داری نبھاتے ہیں، اگر ہم سے کوتاہیاں ہوئی ہیں تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا چاہئے، محض اللہ کی توفیق ہمیں کامیاب وکامران کرتی ہے''۔

جامعیت

مولانا ایک کامیاب معلم رہے، اس لئے علمی تجربات سے خوب گزرے، علوم دینیہ وعربیہ کے ماہر رہے، فقہ وبصیرت سے آگاہ رہے، عربی زبان وادب کے نہ صرف ذوق آشنا، بلکہ اس کے لطائف ونکات اور اسرار ورموز سے واقف رہے، اصلاح کے جذبہ سے سرشار رہے، فکری اعتدال وتوازن ان کے مزاج کا حصہ بنا رہا، اس لئے فرقہ بندی اور

تحزّب سے ہمیشہ گریزاں رہے، خیر وحکمت خواہ جہاں کہیں نظر آجائے اُس کے قدر داں رہے، اہل فضل وکمال کا یکساں احترام کرتے رہے، ان سب خوبیوں کی وجہ سے آپ کی شخصیت میں جامعیت ومحبوبیت پیدا ہوگئی ہے، ظاہر ہے اظہارِ خیال اور اسلوبِ تحریر میں اس جامعیت کا عکس تو نمایاں ہوگا، خوبیاں خوشبو بن کر تحریر میں مہکیں گی، کیوں کہ ادب کا کردار دراصل ادیب کا کردار اور اس کا اسلوب اس کی شخصیت کا عکاس ہوتا ہے، شیعوں کے چند عقائد کی بابت مولانا کی تحریر کی جامعیت ملاحظہ ہو۔

''شیعوں کی کتابوں میں تمام فرق اسلامیہ کو کافر وملعون اور مخلد فی النار کہا گیا، اور ان کو ناصب کا لقب دیا گیا، کتبِ شیعہ صاف کہتی ہیں کہ ناصب کا خون اور مال حلال ہے، سوائے اس کی بیوی کے جس سے نکاح جائز ہے، کیوں کہ مشرکین سے نکاح جائز ہے، کتبِ شیعہ کی تصریح کے مطابق ناصب ہر وہ شخص ہے، جو اول وثانی (حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ) کو حضرت علیؓ پر مقدم کرے، یا ان کی امامت کو تسلیم کرے، کتب شیعہ کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؓ کو اپنے اور مخلوق کے درمیان علامت قرار دیا ہے، جو انکار کرے وہ کافر اور جو اُن کے ساتھ دوسروں کو شریک کرے وہ مشرک اور امامت میں اختلاف کرنے والے کا ایمان نہیں ہے، وہ جہنمی ہے۔ یہ چھ مسائل ایسے ہیں جن کی موجودگی میں اتحاد اور اتفاق بین المسلمین کی بات لغو ہے''۔

واضحیت

مولانا ازہریؒ کی تحریر میں واضحیت کا عنصر بہت نمایاں ہے، کہیں ابہام، غموض اور طوالت پسندی نہیں ہوتی۔ دراصل آدمی کی فکر پختہ ہوتی ہے تو اس کو ابلاغ تام کا ملکہ حاصل ہوجاتا ہے، آپ کے موضوعات دینی رنگ وروح میں اصلاحی، تبلیغی اور تاریخی ہوتے ہیں، آپ نے زندگی اور ادب دونوں میں رنگ آمیزی اور مبالغہ آرائی سے کبھی کام

نہیں لیا، تکلف وتصنع کا کوئی گزر ہی نہ تھا، ہاں سادگی میں دلآویزی اور ابلاغِ تام میں دردمندی واثر انگیزی صاف جھلکتی ہے، کبھی کبھار ایجاز واختصار سے کام لیتے ہیں، مگر وضاحت اور تفہیم متاثر نہیں ہوتی، ان سب خوبیوں کی نشاندہی ذیل کی عبارت سے ہوتی ہے، فرماتے ہیں: ''کیرانہ کا نام جنگ آزادی میں بھی پیش پیش ہے اور وہاں ہی سے مولانا رحمۃ اللہ صاحب کیرانویؒ نے پادریوں کی یلغار کو للکارا تھا، اکبرآباد کے مناظرے کے بعد ان کی گرفتاری کی کوشش کی گئی، کیرانہ کا محاصرہ کیا گیا اور تلاشی ہوئی، مولانا ایک کسان کے بھیس میں کندھے پر لاٹھی رکھے ہوئے گنے کے کھیت سے نکلے تو فوجی نے روکا، مولانا نے فرمایا: کیا ہوا ہے؟ میں تو اپنے کھیت کو جا رہا ہوں، اُس نے راستہ دے دیا اور مولانا روانہ ہوگئے اور گجرات ہوتے ہوئے کشتی سے مکہ مکرمہ پہنچ گئے''۔

صداقت

مولانا ازہریؒ نے اپنی تحریروں کو تابناک بنانے کی کبھی کوشش نہیں کی، البتہ اپنی ہر تحریر میں تاریخی حقائق اور فنی صداقت کا التزام کیا، سیرت وسوانح نگاری میں علامہ شبلیؒ کا نقطۂ نظر یہی تھا کہ سیرت نگار کو صاحبِ سیرت کی زندگی کا ہر پہلو دکھانا چاہئے، روشن بھی اور تاریک بھی، مثبت بھی اور منفی بھی''۔

صداقت وواقعیت کے التزام کا صرف ایک نمونہ ملاحظہ ہو: ''مولوی اکبرعلی خاں، حاجی اصطفاء خاں (مولانا فضل الرحمٰن ندویؒ کے دوست) نماز باجماعت کا اہتمام کرتے تھے، موصوف کی عادت تھی کہ کہیں بھی کسی مجلس میں ہوں نماز کا وقت ہوا اور وہ مسجد کے لئے اٹھ گئے، لکھنؤ شہر کے تمام مساجد میں جماعت کا وقت ان کو معلوم تھا، اگر دوستوں کے اصرار پر سنیما ہال میں ہوتے تب بھی نماز کے لئے اٹھ جاتے، اور بعد ادائے نماز پھر ہال پہنچ جاتے، اس لئے مرحوم (مولانا ازہریؒ کے والد ماجدؒ) ان کو بہت سراہتے تھے''۔

بعض لوگ معائب کے تذکرے کو بدنیتی اور تنگ نظری پر محمول کرتے ہیں یہ ٹھیک نہیں، اقتباس بالا کو پڑھتے ہوئے راقم کا ذہن حضرت کعبؓ بن مالک کے اس رویے کی طرف جاتا ہے جب وہ مدینہ منورہ میں اسلامی جماعت سے الگ تھلگ کر دیئے گئے ہیں، مسجد نبوی میں آتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں، خود کہتے ہیں، میں آپ کے قریب نماز کے لئے کھڑا ہو جاتا اور کنکھیوں سے آپ کو دیکھتا رہتا، جب میں نماز کی طرف متوجہ ہوتا تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم میری طرف التفات فرماتے، جب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اعراض فرماتے۔

بے ساختگی

مولانا ازہریؒ کی تحریروں میں بلا کی سادگی اور بے ساختگی ہے، سوانح نگاری کے موضوع پر ان کا قلم جنبش کرتا ہے تو ایک زندہ انسان کا حال وعمل بیان کرتا ہے، صحت واستناد اس کی اولین ترجیح ہوتی ہے، وہ شاعرانہ اور مبالغہ آرائی کے بل بوتے پر مناقب وفضائل کا حسین مرقع نہیں تیار کرتا، وہ تاریخ نویسی کرتا ہے تو حقائق، واقعات اور عروج وزوال کو بے کم وکاست پیش کرتا ہے، وہ اصلاح حال کے لئے قلم اٹھاتا ہے تو محبت وشفقت کی بوندیں ٹپکاتا ہے، بے ساختگی ذیل کی مثال میں دیکھئے:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں قبلہ کا رخ بیت المقدس کو رکھا، اگر چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رجحان بیت اللہ کی طرف تھا، یہ رجحان بھی اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جو عبادت گاہ بنائی تھی وہ اصل مرکزی نقطہ تھا اللہ تعالیٰ کی وحدت اور عبادت کا، اسلام چونکہ استسلام اور خود سپردگی کا نام ہے، اس لئے اہلِ عقل وخرد اپنے جذبات، دلی احساسات کو اللہ کے حکم کے تابع بناتے ہیں، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کا ہی رخ کیا''۔

مولانا کی زندگی چونکہ ریا و تصنع سے پاک ہے، اس لئے ان کی تحریر بھی ان کی سادہ اور فطری زندگی کی عکاس ہے ، بقول گوئٹے :ایک ادیب کا اسلوب اس کے شعور کی ایماندارانہ نقل کے مترادف ہے، مولانا کا ظاہر و باطن یکساں اور تحریر اندرونی کیفیات کی ترجمان ہے: ؎

انّ الکلام لفی الفؤاد وانّمـــا

جعل اللسان علی الفؤاد دلیلا

(حقیقت میں باتیں تو دل میں ہوتی ہیں، زبان تو محض دل کا ترجمان ہے)

مولانا کی تحریر کی روشنی میں چند نمایاں اخلاقی اور دعوتی پہلو

مولانا کی سادگی اور انکساری، ان کی طبیعت کی نرمی اور حلیمی، ان کی نجابت و شرافت، ان کی خوش اخلاقی اور لکھنوی وضع داری، ان کی شیریں کلامی اور ملنساری، ان کی خورد نوازی اور انسان دوستی، ان کی علم دوستی اور حق پسندی کے مجموعے سے ان کی شخصیت ترکیب پائی ہے، وہ دینی علوم کے ماہر ہیں، وہ بصیرت مند داعی ہیں، وہ ایمان و یقین کی لذت سے سرشار ہیں ، وہ تقویٰ شعار اور راست رو ہیں ،حلم ،صبر، عزیمت ،توکل ،زہد و استغنا ان کا زادِ راہ ہے، وہ دلخراش حرف وصوت سے کام نہیں لیتے ،وہ تاحیات علم پروری کرتے رہے، اس کے لئے انہوں نے زبان و قلم دونوں کا سہارا لیا، مگر کبھی کوئی اشتعال انگیز بات نہ لکھی نہ کہی، چونکہ وہ ندوی فکر کے نمائندہ بلکہ بقول ایک ندوی فاضل اس کے آئیڈیل تھے، اس لئے وہ ہمیشہ تحزّب سے بالاتر رہے، پارٹی لائن بیس پر انہوں نے کبھی کام کرنے کا سوچا ہی نہیں، ان کی تحریروں اور دعوتی جہد و کاوش کا دھارا امت کی سمت بہتا تھا، ان کا زمانہ تحریکوں، انجمنوں اور پارٹی بندیوں کا تھا، مگر فطری طور سے انہوں نے اپنے

لئےتحزّب کوکبھی پسند کیا ہی نہیں۔

آپ کی تحریروں کی روشنی میں چند دینی،علمی،دعوتی،اصلاحی خصوصیات کی طرف اشارے کئے جاتے ہیں:

(۱) آپ دعوت واصلاح کے لئے تحریروں سے زیادہ پیکرِعمل بن جانے کی طاقت کو زیادہ موثر سمجھتے تھے،اس لئے''عملِ مجسم''بن جانے کی روشِ زندگی پر قائم رہے۔

(۲) آپ اصلاح امت کے لئے تعلیم وتربیت کو بڑی اہمیت دیتے تھے،آپ کے خیال میں معیاری اور مثبت تعلیم وتربیت کے ذریعہ زندگی کا نقشہ بدلا جاسکتا ہے۔

(۳) آپ نے دعوت وتبلیغ کیلئے تحریر وتقریر، وعظ وارشاد،تصنیف وتالیف وغیرہ وسائل سے کام لینے کی اہمیت کومحسوس کیا اورعملا برتا بھی۔

(۴) آپ افراط وتفریط سے نالاں اوراعتدال کے خوگر رہے،بدعات وخرافات سے مجتنب رہے،اورقرآن وسنت کی ترویج کے لئے کوشاں رہے۔

(۵) آپ نے فرقِ باطلہ کا گہرا مطالعہ کیا تھا،ان کے مکر وکید اور سازشوں سے واقف تھے،اس لئے کامیابی کے ساتھ ان کا تعاقب کیا۔

(۶) آپ زندگی بھرایک کامیاب معلم،ایک دانش مند مربی،ایک دردمند داعی،ایک مخلص مصلح اوراسلام کے وفادار سپاہی کا کردارادا کرتے رہے۔

(۷) قرآن کریم سے آپ کو بے پناہ شغف تھا،والدین نے آپ کا نام''محبوب الرحمٰن'' رکھا تھا،مخلوقِ خدا نے آپ پرمحبوبیت کی سوغات لٹائی،اب دعا ہے کہ رحمتِ خداوندی کی رُت برکھا آپ پر مسلسل ہوتی رہے۔ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

باب ہشتم

تالیفات وتصنیفات

تمہید

علم وفضل کی دنیا میں ایسی بے شمار اور باکمال ہستیاں ملیں گی، جنہوں نے تصنیف وتالیف کے مقابلے میں شخصیت سازی کو ترجیح دی، اپنے پیچھے علمی یادگاریں چھوڑ جانے کے بجائے باکمال انسانوں کو چھوڑ جانا پسند کیا، مولانا محبوب الرحمٰن صاحبؒ عالمانہ شان رکھتے تھے اور ٹھوس صلاحیتوں کے مالک تھے، تالیف وتصنیف کی طرف توجہ فرماتے تو ڈھیر ساری کتابیں لکھ جاتے، مگر انہوں نے شخصیت سازی اور مردم گری کو پسند کیا، تاہم متعدد علمی یادگاریں بھی چھوڑی ہیں، جو بقامتِ کہتر بقیمتِ بہتر اور دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مصداق ہیں، ان کتابوں کی قدر وقیمت کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے ہوتا ہے، ایک ندوی فاضل لکھتے ہیں:

''مولانا مرحوم نے چند علمی یادگاریں چھوڑی ہیں؛ ''جو علم ینتفع بہٖ'' کا مصداق ہیں، جن میں دروس الاشیاء والمحاورۃ العربیہ جو بہت سے مدارس میں داخل نصاب ہے اور عربی زبان کی ایک مقبول سہل انداز ریڈر ہے اور مبتدی طلباء کو عربی سکھانے کا ایک بہترین تحفہ ہے۔ اسی طرح ''سفر قادیان'' جوان کی داعیانہ دلسوزی اور تب وتابِ جاودانہ کا عمدہ نمونہ ہے، اپنے موضوع پر مختصر اور قادیانیت کی اسلام دشمنی کے تعارف میں جامع کتاب ہے، اس کے علاوہ مولانا مرحوم کے تحریر کردہ چند رسالے ''شیعیت خود اپنے آئینے میں''،

''مسجد اور مسلمان''وغیرہ مفید رسالے ہیں''۔

آپ کی تصنیفات کی چند جھلکیاں مندرجہ ذیل ہیں۔

قادیانیت کا مقابلہ اور مولانا ازہری

مولانا مرحوم کا ایک اہم کارنامہ ان کی دینی فکرمندی اور اسلام کی بقا وحفاظت کے لیے سب کچھ کرگزرنے کی بات تھی، ایک مرتبہ بعض قادیانیوں نے دھوکے سے حج کا ویزا لگوالیا تھا اور بہت ممکن تھا کہ یہ کافر حرم میں داخل ہوجاتے، مولانا کی ہمت دیکھئے! مولانا نے دلی کا سفر کیا اور تمام تر محنت کرکے سفارت خانہ (Embassy) جاکر ان کا ویزا کینسل کروادیا، یہ کسی جہاد سے کم نہ تھا، بہت ممکن تھا کہ قادیانی آپ کی جان کو آجاتے مگر آپ نے اس کی پرواہ نہ کی اور حق کا یہ مجاہد مصروف جہاد رہا، یہ وقتی جوش کا نتیجہ نہ تھا بلکہ آپ ہمیشہ مخالفین اسلام، دشمنان دین کی تحریکات ان کی ایکٹی وٹیز (Activities) پر نظر رکھتے تھے اور ان کے قلع قمع کی ہر ممکن کوشش فرماتے تھے، آپ نے قادیانیوں کے قدم اکھاڑنے و باطل کو تہس نہس کرنے کیلئے ضرورت پڑنے پر وقت کے فرمانرواؤں سے بھی مراسلت فرمائی ہے، چنانچہ آپ نے قادیانیوں کے عقائد، ان کے خیالات، ان کی سرگرمیوں کی پوری معلومات شاہ فیصل کو لکھی اور ان سے مطالبہ کیا کہ ان کو حرمین شریفین کی زیارت کی اجازت نہ دی جائے، یہ نام تو مسلمانوں کا رکھتے ہیں لیکن حقیقت میں یہ کافروں سے بدتر ہیں، نتیجتاً قادیانی بھی آپ کے پیچھے لگ گئے، بعض مواقع پر آپ کی جان کو خطرہ لاحق ہوگیا، لیکن آپ مسلسل اس جہاد میں جان کی پرواہ کیے بغیر لگے رہے، سچ ہے ''من کان للّٰہ کان اللّٰہ لہ''۔

فانوس بن کے جسکی حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

قادیانیت کا مقابلہ اور اس کی سرکوبی

آپ نے اس کے لیے اپنی علمی و قلمی اور عقلی قوت صرف کر دی، اور جب تک اس مہم میں کامیاب نہ ہوئے اطمینان کی سانس نہ لی۔

آپ نے قادیانیت کی تردید میں ''سفر قادیان'' کے نام پر ایک رسالہ تحریر فرمایا جو کہ ۴۶ر موضوعات پر مشتمل ہے اور اس رسالہ کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے، انھوں نے اس کو وقت کا افضل ترین جہاد قرار دیا اور اس کے لیے لوگوں کو ہر قسم کی کوشش اور قربانی پر آمادہ کرنے کی کوشش کی، اور بڑی دلسوزی کے ساتھ اس کی اہمیت سمجھائی، جس نے ان کی بات کو مانا وہ اس خطرہ سے محفوظ ہو گیا اور ہندوستان کے اور دوسرے علاقوں میں بھی جہاں کہیں مولانا کا یہ رسالہ پہنچا، یا اس فرقہ ضالہ کے خلاف آواز پہنچی، وہاں سے قادیانیت کے قدم اکھڑ گئے، مسلمانوں پر اس نئے دین کی حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی اور ہزاروں لاکھوں مسلمان اس فتنہ سے محفوظ ہو گئے۔

مولانا کی اس دلسوزی، سیماب وشی، بے قراری، اور مسئلہ میں غیر معمولی ذکی الحسی کا سبب سمجھنے کے لیے اور اُن کی کوششوں اور قربانیوں کی قدر و قیمت اور اہمیت کا اندازہ کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ قادیانیت پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے کہ قادیانیت سے اسلام اور عالم اسلام کو وہ کیا بڑا خطرہ درپیش تھا جس نے مولانا کو اس قدر بے چین کر رکھا تھا اور ان کی راتوں کی نیند اور دن کا آرام ختم کر دیا تھا، جب ہم مولانا مرحوم کے رسالہ سفر قادیان کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ان خطرناک اور تباہ کن عناصر کا پتا چلتا ہے، جو نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم اور بالآخر پورے اسلامی نظام کو نہ صرف نقصان پہنچانا چاہتے ہیں، بلکہ خاکم بدہن ان کے کھنڈر پر ایک نئی عمارت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

سفر قادیان

مولانا مرحوم کا یہ رسالہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء کے مقدمے سے آراستہ ہوکر شائع ہوا ہے، اس رسالہ میں مولانا نے قادیانیت کے تار و پود بکھیر دیئے ہیں، مؤلف نے طرز نگارش بڑا دلکش اپنایا ہے، جو نہایت مؤثر اور ایمان افروز ہے، اس رسالہ کے بارے میں مقدمہ کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے۔

''انہوں نے قادیانی ذمہ داروں کے احوال و اعمال کا گہرا مطالعہ کیا اور جائزہ لیا، اس کے بعد جو حقائق سامنے آئے وہ انہوں نے ایک کتاب کی شکل میں جمع کئے اور اسی فرقہ کے امام غلام احمد کی ان حرکتوں کا اہم انکشاف کیا ہے، جس سے ان کا اسلام کے بنیادی اور لازمی احکام کے خلاف ہونا ثابت ہوتا ہے، مولانا کی اس کتاب سے غلام احمد قادیانی کے خلفاء اور متبعین کے بارے میں ایسی ایسی خلاف اسلام باتیں سامنے آتی ہیں جن کی ایک عام مسلمان سے بھی توقع نہیں کی جاتی ہے، ان انکشافات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک سازش ہے، جس کے ذریعہ مسلمانوں کا ان کے دین حق سے برگشتہ کرنے اور مسلمانوں کی مذہبی معاملہ میں غلط راہ پر ڈالنے کی کوشش کی جارہی ہے اور اس کوشش میں بہت فراخی کے ساتھ روپئے خرچ کئے جاتے ہیں، جو صرف عوامی وسائل سے حاصل نہیں ہوسکتے، اس طرح اسلام کے خلاف کئے جانے والے فتنوں میں یہ تحریک ایک بڑا فتنہ ثابت ہورہی ہے'' تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔(۱)

مولانا امین الدین شجاع الدین صاحب اپنے مضمون بانگ حراء میں صفحہ ۱۶۶ر پر تحریر فرماتے ہیں کہ ''میرے ایک استاذ نے کہا کہ رد قادیانیت پر آپ کتابیں دیکھئے، لیکن اس کے ساتھ اس مرد مجاہد کو بھی دیکھئے جنہوں نے عالم اسلام کے اربابِ حل و عقد کو فتنۂ

(۱) (سفر قادیان مقدمہ مولانا محمد رابع صاحب حسنی ندوی ص ۸۔۹)

قادیانیت پر متوجہ کیا، ان کی کوشش فتنۂ قادیانیت سے آگاہی تک محدود نہیں رہی بلکہ انہیں اسلام سے خارج قرار دیئے جانے کی مہم میں بھی ان کا اہم رول رہا، ہمارے دلوں میں مولانا ازہری کے لئے عزت وتکریم میں اضافہ ہوا، ہم طلبہ نے اب تک مولانا کو دیکھا نہ تھا یا دیکھا بھی ہو تو پہچانتے نہیں تھے لیکن جب دیکھا تو ان کی سادگی اور شفقت کو دیکھ کر ان کی عزت ومحبت میں اور اضافہ ہوا''۔

مولانا کے اس رسالہ کا اثر

مولانا کے اس رسالہ نے اتنا کام کیا کہ بعض اوقات قادیانی مبلغ یہ علم ہوتے ہی کہ مولانا کے رسالہ کی فلاں جگہ لوگوں میں عام اشاعت ہورہی ہے وہ جگہ چھوڑ کر چلے گئے اور جب وہاں بھی اس رسالہ نے ان کا تعاقب کیا تو ان کو کسی تیسری جگہ پناہ لینی پڑی یہاں تک نوبت آئی کہ مولانا کا نام ہی قادیانیوں کی شکست کا رمز بن گیا۔

دروس الاشیاء والمحاورة العربیة

اس مشہور تصنیف کے سلسلہ میں مولانا مرحوم کے داماد مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی یوں رقم طراز ہیں:

جامعہ ازہر سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ندوہ کے عرصہ قیام میں مولانا موصوف نے اپنی یہ مشہور عربی ریڈر تیار کی، پہلا ایڈیشن نامی پریس لکھنؤ سے ۱۹۴۷ء میں مولانا محمد عمران خان ندوی ثم ازہریؒ کے پیش لفظ سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آیا، اس ریڈر میں مولانا مرحوم نے عربی زبان ڈائریکٹ میتھڈ (Direct Method) کے ذریعہ پڑھانے کا طرز اختیار کیا ہے، دار العلوم ندوة العلماء اور اس کے ملحقہ مدارس کے نصاب درس میں شامل ہے اور اس کے بے شمار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، عربی زبان سکھانے کی یہ کامیاب

کوشش ہے، مولانا موصوف نے اپنی اس ریڈر کے تیار کرنے میں جامعہ ازہر میں انگریزی زبان کے اپنے ایک کنیڈین استاذ اور ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشیؒ (متوفی ۱۹۸۷ء) کے عربی زبان سکھانے کے طریقہ تدریس کو اپنایا ہے۔

اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے جناب امین الدین شجاع الدین صاحب بانگ حراء صفحہ ۱۶۶ ر میں یوں لکھتے ہیں:

''دروس الاشیاء والمحاورۃ العربیۃ دراصل مولانا ازہری کے وہ (Notes) ہیں جن کو سامنے رکھ کر مولانا عربی زبان کے جملے بنانے اور عربی بولنے کی مشق کراتے تھے''۔

مسجد اور مسلمان: حقائق و ذمہ داریاں

مولانا نے اپنی اس کتاب میں اجاگر کیا ہے کہ ماضی میں مسلمانوں کا مسجد سے کن کن میدانوں سے تعلق رہا ہے، اور اسلام میں تعمیر مسجد کی ابتداء سے لے کر تعمیر مسجد کے اغراض ومقاصد کو حسب ذیل عنوانات کے ذریعہ اجاگر کیا ہے، عمومی اجتماعی عبادت گاہ، تعلیمی مرکز، دعوتی وتبلیغی مرکز، عدالت عالیہ، دارالخلافہ بشمول مالیاتی مرکز، فوجی ہیڈ کوارٹر، مہمان خانہ یا سرکٹ ہاؤس، مجلس شوریٰ یا پارلیمنٹ، مسجد کی عمومی حیثیت علاوہ ازیں، احترام مسجد ،موضوعات پر روشنی ڈالی ہے۔

(از مولانا ابوسحبان روح القدس بانگ حراء کا ص ۳۸۔۳۹)

المنتخبات العربیہ کا تجزیاتی مطالعہ

مولانا نے ادب عربی کے ذوق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نفع رسانی کے لئے بے پایاں کاوشوں کے ذریعہ اشاعت کا کارنامہ انجام دیکر کارخیر میں حصہ فراہم کیا، عربی میں ''دروس الاشیاء'' اور ''المنتخبات العربیہ'' کی تصنیف وتالیف کر کے طلباء علوم نبوت'' حامل

قرآن وسنت'' کوقلم وقرطاس کا کارآمد خزانہ دیا، تحلیل وتجزیہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نمونہ ذوق سلیم کا بہترین ثبوت ہے، ثانی الذکر کتاب مولانا موصوف نے مایہ ناز محقق علامہ معصومی کے ساتھ ترتیب دی، جس میں عرب شعراء کرام کے بیش قیمت خزانہ میں سے عمدہ اور دلچسپ مجموعہ اشعار جمع ہوگیا، بالفاظ دیگر گلدستہ شعراء میں سے عبقری اور باکمال شعراء کے اشعار کا عمدہ اور ادب عربی کے بلند معیار کے مطابق انتخاب کیا ہے، یہ کتاب دونوں چیزوں کا سنگم ہے، ادبی شہ پارے والے اشعار کو کتاب میں ترجیح دی، ژرف نگاہی کے لئے ژالہ باری شاہد ومبین ہے، یہ کیا ہی حسن امتزاج ہے؟ جو علامہ معصومی کی ساجھے داری میں عرصہ قیام کلکتہ، مدرسہ عالیہ میں پائے تکمیل کو پہنچ کر منظر عام پر آیا، اس میں دور جدید سے لیکر جاہلی ادوار تک کے اشعار کا انضباط ہے، اس میں شعراء کرام پر مختصر نوٹ لکھا اور سخت الفاظ کا سہل الفاظ میں ترجمہ کیا ہے، جو رعنائی ودلکشی کا سبب بنا، شعر میں حقیقت کی عکاسی ہوتی ہے، یعنی ماسبق سے واقف ہوکر حال سے نبرد آزمائی کی صلاحیت اور مستقبل کا بیڑا سر کرنے کی ہمت فراہم کی جاتی ہے، اس کیلئے بھی توجہ کا مرکز بنا اور مدرسہ عالیہ کے نصاب میں شامل ہوا، مزید زینت میں چار چاند لگانے اور اہمیت دو چند کرنے کیلئے مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے مقدمے سے مزین کیا اور اہل علم کے مابین مشتہر ہوا۔

مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی ''مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء'' کے الفاظ میں: مولانا موصوف نے اور مولانا معصومی نے عربی اشعار کا ایک مجموعہ ''المنتخبات العربیہ'' قسم النظم'' کے نام سے تیار کیا تھا جو حضرت مولانا علی میاں صاحب کے مقدمے کے ساتھ اشاعت پذیر ہوا، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عصر حاضر کی شاعری سے شروع ہوتا ہے اور عصر جاہلی کی شاعری پر اس کا اختتام ہوتا ہے۔(۱)

مولانا مرحوم کے خویش مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:

(۱)(بانگ حرا صفحہ ۲۸ رخصوصی شمارہ۔

مولانا ازہری نے کلکتہ کے عرصہ قیام میں ''المنتخبات العربیہ'' عربی زبان کے ادیب وشاعر علامہ معصومی کی مشارکت میں ترتیب دیا، جو مولانا سید ابوالحسن ندوی کے مقدمے سے آراستہ ہوکر ۱۹۵۷ء میں منظر عام پر آیا، یہ مجموعہ مدرسہ عالیہ کے نصاب درس میں شامل ہے، اس انتخاب کی ترتیب میں عصر حاضر سے عہد جاہلی تک کا نمونہ کلام پیش کیا گیا ہے، ہر شاعر کا سطر دوسطر میں جامع تعارف کے ساتھ ساتھ مشکل الفاظ کی عربی میں تشریح بھی کی گئی ہے۔(۱)

آپ کے اہم اور قیمتی مضامین

آپ کے مقالات اور مضامین کی تعداد چودہ ہیں، ان میں سے ہم چند مقالات اور مضامین کی جامعیت پر روشنی ڈالتے ہیں جس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مولانا مرحوم کو اللہ نے ذوق قلم کی بے مثال دولت سے نوازا تھا، یہاں بطور نمونہ ان مقالات سے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں، جن سے ان مضامین کی روح کو سمجھا جاسکتا ہے، اولاً ان مقالات کی فہرست ملاحظہ ہو۔

۱۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ ۱۷۸۱ء سے ۱۹۵۴ء تک

۲۔ شیعیت خود اپنے آئینے میں

۳۔ عبور قلزم یا نیل؟

۴۔ بیان اللسان ڈکشنری پر تبصرہ

۵۔ بھاجپا سے ارتباط

---

(۱) (میں اور میرے ابو چند یادیں صفحہ ۲۳)

مدرسہ عالیہ کلکتہ

مدرسہ عالیہ کلکتہ کے مضمون میں مولانا ایک جگہ یوں فرماتے ہیں:

''۵ستمبر ۱۷۸۰ء میں چند مسلمان اکابرین اور اہل قلم حضرات ایک وفد کی شکل میں میرے پاس آئے اور ایک عرضی پیش کی جس میں درخواست کی گئی تھی کہ ایک تعلیمی ادارے کے قیام کیلئے مولانا مجدالدین نامی ایک عالم دین کو جو حال ہی میں وارد صوبہ ہوئے تھے، اس پر آمادہ کروں کہ یہاں رہ کر نوجوان طالب علموں کو قوانین اسلامی و دیگر علوم جو مسلم اداروں میں سکھائے جاتے تھے، سکھائیں اور یہ کہ مولانا موصوف کی شخصیت علمی اعتبار سے عدیم المثال ہے۔ اراکین وفد نے یہ بھی کہا مدرسہ یا کالج کے قیام کیلئے یہ ایک نہایت مناسب موقع ہے اور مولانا مجدالدین جیسے لائق وفائق بزرگ اسکی تشکیل اور صحیح رہنمائی کیلئے نہایت موزوں ثابت ہوں گے۔''

شیعیت خود اپنے آئینے میں

مولانا تحریر فرماتے ہیں: ''اسلام اپنے وجود میں سب سے قدیم ترین مذہب ہے، اس نام سے اس کی نشان دہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے منسوب ہے: ''ملة أبيكم ابراهيم هو سماكم المسلمين من قبل'' اگرچہ اس کی تشخیص وتعین ،تجدید وتفصیل نزول قرآن اور بعثت محمدی سے ہوتی ہے، اپنی قدامت سے ہی اس کی مخالفت اور عداوت بھی قدیم ہے، ہر دور میں اختلاف کیا گیا، دشمنوں نے اس کی محدود تعلیمات کو نہ صرف رد کیا بلکہ جنگ وجدال بھی کرتے رہے، شروع میں عقیدہ توحید کی مخالفت میں تعدد الٰہ کو پیش کیا گیا، بعثت رسل کی تکذیب ہی نہیں کی گئی بلکہ ان کو قتل کیا گیا اور مختلف قسم کے عذاب میں مبتلا کیا گیا، حرام وحلال میں من مانی تبدیلی کی گئی۔

بعثت محمدی سے قبل تمام مختلف فرقے اور گروہ آپس میں دست بہ گریباں تھے کہ مشیت ایزدی نے جنگ وجدال میں مصروف دنیا پر رحم کھایا اور اس کی صحیح رہنمائی کیلئے آخری نبی کی بعثت کی، ابتدا میں مقامی، خاندانی اور قبائلی چشمک نے مقابلہ کیا اور اسلام کے حلقہ بگوشوں کی کثرت اور پھیلاؤ نے سب کو متوجہ کر دیا کہ وہ اس بظاہر نئے دین کا مقابلہ کریں''۔

عبور قلزم یا نیل؟

مولانا مرحوم اس مضمون میں تحریر فرماتے ہیں: ''سب سے زیادہ معتبر، قابل استناد ثبوت ہمارے سامنے قرآن ہے جس نے تورات وانجیل کی بھی تصدیق کی ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس قرآن کی شہادت سے تورات وانجیل کے معتبر نسخے ہمارے ہاتھ میں موجود نہیں اور موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں تورات کی شہادت کو میں ضرور ترجیح دیتا؛ لیکن دو وجہوں سے میں معذور ہوں، ایک تو یہ کہ قرآن کی شہادت کے مطابق تورات کا کوئی غیر محرف نسخہ موجود نہیں، دوسرے میں لفظ کی تحقیق میں اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا کیونکہ لفظ کے استعمال یا معنی میں بہت کافی گنجائش ہے کہ اس سے قلزم یا نیل یا اور کوئی دریا یا جھیل مراد لی جائے، اس لئے یہ تو متعین ہے کہ غرق پانی میں ہوا لیکن وہ کہاں اور کون سا پانی ہے، اس کی تشریح مفسرین اور شارحین نے کی ہے، اور مختلف اقوال ہونے کی وجہ سے ہمیں دوسرے تاریخی یا عقلی دلائل کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

بیان اللسان ڈکشنری پر تبصرہ

اس مضمون میں مولانا مرحوم تحریر فرماتے ہیں کہ: ''بیان اللسان'' کے مطالعہ سے خیال ہوتا ہے کہ اس کے مؤلف ایک نوجوان شخص ہیں، اگرچہ ان کے احباب کا بیان ہے کہ یہ

خیال زیادہ صحیح نہیں ہے، تاہم اس غلط فہمی میں مبتلا رکھنے کے لئے کتاب میں جنسی اور جذباتی معنی کی فراوانی کافی ہے، قاضی صاحب نے کہیں بھی جذباتی معنی سے درگذر نہیں کیا اور لفظ کے دوسرے غیر جذباتی معنی نظر انداز کر گئے جبکہ جذباتی معنی سے مختلف لغویین اور مصنفین چشم پوشی کر جاتے ہیں، ممکن ہے قاضی صاحب اپنی تالیف نوجوان طبقے میں مقبول بنانا چاہتے ہوں ملاحظہ ہو ''قعو'' (ص ۶۲۷) جس کے معنی المنجد نے یوں بیان کئے ہیں: قعی یقعی قعا:اشرفت ارنبیةانفه ممالة نحو القصبة ''۔(القعو صفحہ ۶۸۲)

بھاجپا سے ارتباط

مولانا مرحوم اپنے اس مضمون میں تحریر فرماتے ہیں: ''مجھے یاد ہے کہ ۱۹۳۶ء میں جب مصر کی آزادی کا مرحلہ درپیش تھا، وہاں اقلیت اور اکثریت کا معاملہ تھا، اکثریت مسلمانوں کی تھی جو ۸۵ر فیصد کے لگ بھگ، ان کے اس وقت اقلیتوں کے نمائندے نقرائی پاشا تھے اور وزیر اعظم محمد محمود پاشا تھے دونوں فریق نے براہ راست گفتگو کی، پہل اکثریت کی طرف سے ہوئی اور نقرائی پاشا سے پوچھا گیا کہ آپ ان کے لئے کیا مراعات اور تحقیقات چاہتے ہیں، اس کو تحریر کر لیجئے، اس پر فریقین کے دستخط ہو جائیں گے اور معاملہ طے ہو کر ختم ہو جائے گا، نقرائی پاشا نے ایک تحریر قلم بند کی اور محمود پاشا سے پوچھا کہ آپ ہم کو کیا دینا چاہتے ہیں؟ اس کے جواب میں محمود پاشا نے کہا کہ ہم آپ کو چالیس فیصد سے زیادہ حقوق دینا چاہتے ہیں، اس پر نقرائی پاشا نے فوراً اپنی تحریر پھاڑ دی اور کوڑے دان میں ڈال کر کہنے لگے کہ ہم کتنا ہی زیادہ مطالبہ کریں گے اس حد کو نہیں پہنچیں گے، ہم سادے کاغذ پر دستخط کرنے کیلئے تیار ہیں، اس طرح اقلیت اور اکثریت کا مسئلہ جڑ سے ہی ختم ہو جائے گا اور کسی کو معلوم ہی نہیں ہوگا کہ مصر میں اکثریت اور اقلیت کا کوئی مسئلہ ہے، نقرائی پاشا وزارت میں وزیر مال تھے۔

باب نہم

مولانا کی علالت اور وفات

علالت

زندگی کا سچا مسافر جس کی قیمتی حیات کا ایک ایک لمحہ دین کی سربلندی اور اس کی نشرواشاعت میں صرف ہوا، بالآخر زندگی کے آخری پڑاؤ پر بیمار ہوگیا، بیماری کے ایام دو تین ماہ پر ممتد رہے، اس طرح زندگی بھر کا تھکا ہارا مسافر اپنے رب سے انعام لینے کے لئے تیار تھا، کہ رب سے لقاء اور انعام کے لئے اس دنیا کو الوداع کہنا پڑتا ہے، اور اس دارفانی سے دار آخرت کی طرف کوچ کرنا پڑتا ہے، اور سب کے لئے اللہ تعالی نے یہی راہ متعین کی ہے، چنانچہ حضرت مولانا محبوب الرحمٰن صاحب کو بھی یہی راہ اختیار کرنی پڑی۔

وفات

اور ”كل نفس ذائقة الموت“ کے پیش نظر اور ضابطہ الٰہی ”كل من عليها فان“ کے تحت اور ”وما كان لنفس أن تموت إلا بإذن الله كتابا مؤجلا“ کے تحت ۴/ جمادی الاولی ۱۴۳۱ھ مطابق ۱۹/اپریل ۲۰۱۰ء کو سپیدۂ سحر طلوع ہوتے وقت ۹۱ سال دو ماہ کی عمر میں اس دارفانی کو چھوڑ کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

"إنا للّٰه وإنا إليه راجعون"

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

آہ امت مسلمہ کا ایک روشن ستارہ غروب ہوگیا۔ مولانا کی زندگی حق گوئی و بے باکی، حق فہمی وبلند ہمتی سے عبارت تھی، مولاناؒ کا وجود راست گوئی وثابت قدمی کا آئینہ دار تھا، آپ بذات خود اسلام کے پہرہ دار، قادیانیت کے لئے صیقل شدہ تلوار تھے، مولانا مرحوم کی وفات کو علمی ودینی حلقوں میں بڑا خسارہ سمجھا گیا اور امت نے علوم اسلامیہ وادب عربی کے خادم کے رخصت ہونے کا غم محسوس کیا: ؎

اب صبا سے کون پوچھے گا سکون گل کا راز
کون سمجھے گا چمن میں نالۂ بلبل کا راز

سچ تو یہ ہے کہ امت اسلامیہ کا یہ خادم اور قرآن کریم کا محافظ زبان حال سے دنیا کی بے ثباتی کا درس دے گیا: ؎

پلٹ کے کہتی ہیں یہ آنکھوں کی پتلیاں
دم مرگ چلو یہاں سے کہ دنیا کا اعتبار نہیں

اخیر میں بس یہی دعا ہے کہ اللہ تعالی ہمیں مولانا کا نعم البدل عطا فرمائے اور مرحوم کو نیکیوں وخلوص ومحبت کا بھر پور صلہ دے اور فردوسِ بریں میں اپنی چاہتوں اور خوشیوں کا تاج پہنا کر ان کی عظمت کو دوبالا کرے۔ (آمین)

مثل ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

مرشد الامت حضرت مولانا سید رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم (صدر آل انڈیا مسلم

پرسنل لاء بورڈ وناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء) کی امامت میں بعد نماز عصر ندوۃ العلماء کے سبزہ زار میں جنازے کی نماز پڑھی گئی اور ایک بڑے مجمع نے اشکبار آنکھوں کے ساتھ ڈالی گنج کے گنج شہیداں میں سپرد خاک کر دیا ؎

کیا لوگ تھے جو راہ وفا سے گزر گئے
جی چاہتا ہے نقش قدم چومتا چلوں

موت اس کی ہے جس پہ زمانہ کرے افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں جانے کیلئے

باب دہم

باقیات صالحات

تمہید

اس دنیا سے چلے جانے کے بعد انسان کے تمام اعمال کے اجر وثواب کا دروازہ بند ہو جاتا ہے، اس کی نیکیوں کی ساری فائلیں بند کردی جاتی ہیں، مگر حدیث میں آتا ہے:

"إذا مات الإنسان انقطع عمله إلا من ثلاث، صدقة جارية، أوعلم ينتفع به أو ولد صالح يدعوله ۔(رواہ مسلم)

جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے سوائے تین اعمال کے کہ وہ جاری رہتے ہیں:

(۱) صدقہ جاریہ مثلاً کوئی رفاہی کام کیا ہو، کوئی مسجد بنائی ہو، کوئی مدرسہ بنایا ہو، یا کوئی بھی ریلیف کا کام کیا ہو۔

(۲) یا ایسا علم چھوڑا ہو، جس سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہوں، چاہے تصنیف وتالیف کی شکل میں ہو، یا شاگردوں کی شکل میں ہو یا اور کوئی علمی کام ہو۔

(۳) نیک صالح اولاد چھوڑی ہو، جو اس کے لئے مرنے کے بعد دعا کرتی ہو، ماشاء اللہ! اللہ تعالی نے حضرت مولانا محبوب الرحمٰن صاحب ازہری کو تینوں طرح کی نیکیاں کرنے کا موقع دیا، آپ نے اسکول بھی بنایا، تصنیفات بھی چھوڑیں، شاگردوں کا بھی

ایک عظیم سلسلہ چھوڑا اور نیک صالح اولاد بھی، روحانی اولاد بھی اور حقیقی اولاد بھی، اس طرح اللہ تعالیٰ نے وفات کے بعد آپ کے لئے ثواب اور صدقہ جاریہ کا سلسلہ جاری رکھا ہے، جس سے آپ کو ضرور فائدہ ہو رہا ہوگا، چنانچہ باقیات صالحات میں آپ کی اولاد کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

معنوی اور حقیقی اولاد

مولانا کے بھانجے مولانا نعیم صدیقی لکھتے ہیں ''کہ ماموں جان کی کلکتہ اور ندوہ میں تدریس کی خالص مدت (۷۰) سال پر محیط ہے، اس لیے ان کی معنوی اولاد شمار و حد احصاء سے باہر ہے، جو ہندو پاک، بنگلا دیش، سنگاپور، ملیشیا اور انڈونیشیا وغیرہ جیسے ملکوں میں علم کی شمع روشن کئے ہوئے ہیں اور جسمانی اولاد میں تین لڑکیاں اور تین لڑکے یادگار ہیں، ماموں جان کی پہلی شادی ان کے حقیقی چچا مولانا عزیز الرحمٰن ادیب (جنہوں نے ندوہ سے فراغت کے بعد خیرآباد (اودھ) ضلع سیتاپور میں بساط درس آراستہ کی اور نہایت زہد وقناعت کے ساتھ تاحیات تشنگان علم کو سیراب کرتے رہے) کی دختر عابدہ خاتون سے ہوئی تھی، جو بہت مختصر رفاقت کے بعد اللہ کو پیاری ہوگئیں، ان سے ایک بچی ثروت رحیمہ یادگار ہے، جن کی شادی میرٹھ میں جناب عتیق احمد صدیقی کے ہمراہ ہوئی، ان کا ایک بیٹا محمد زاہد سلّمہٗ حافظ قرآن ہے۔

پہلی ممانی جان کے انتقال کے کافی عرصہ بعد ماموں جان کی دوسری شادی بہار کے ایک متوسط دیندار گھرانے میں حکیم محمد ضمیرالدین کی صاحبزادی اور پروفیسر عبدالمجید کی ہمشیرہ اسماء خاتون سے ہوئی، بلاشبہ ممانی اسماء خاتون گوناگوں محاسن وفضائل اور اخلاق سے متصف تھیں، وہ ماموں جان کے لیے صحیح معنوں میں باعث ''مودّۃ وسکینۃ'' ثابت ہوئیں اور نہایت شکر وقناعت، وفا شعاری اور رابعہ سیرتی کے ساتھ لکھنؤ کی ہوکر رہ گئیں، مرحومہ

ممانی جان نے راقم سطور کو گود کھلایا تھا، اس لیے رہتی عمر وہ عاجز پر اپنے حقیقی بیٹے کی طرح شفقت ومحبت لٹاتی رہیں، قضائے ایزدی سے آخر عمر میں وہ متعدد امراض مزمنہ میں مبتلا ہوگئیں، یہاں تک کہ وفات سے کچھ عرصہ قبل فالج کے زیر اثر آگئیں، اور پھر جلد ہی ۲۰۰۷ء میں اس دار فانی سے رخصت ہو کر اعلیٰ علیین میں پہنچ گئیں: "اللّٰھم اغفر لھا وارحمھا رحمۃ واسعۃ" ان ممانی سے تین لڑکے اور دو لڑکیاں یادگار ہیں، جو سب بحمد اللہ اپنے اپنے مقام پر خوش وخرم زندگی گزار رہے ہیں، سب کے مختصر حالات تحریر کئے جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر سعید الرحمٰن فیضی ندوی

بڑے بیٹے ڈاکٹر سعید الرحمٰن فیضی نے ندوۃ العلماء سے حفظ قرآن وقرأت کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد عالمیت کی سند حاصل کی، پھر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں طبیہ کالج سے بی یو ایم ایس کا کورس کیا، سعودی عرب کی دار السلطنت ریاض میں طویل عرصہ بسلسلۂ ملازمت گزارنے کے بعد کناڈا کی سرزمین میں جا بسے اور وہاں دعوت وتبلیغ کے میدان میں سرگرم عمل ہیں، راقم نے ۲۰۱۸ء میں ان کی ہمارے ادارے مرکز احیاء الفکر الاسلامی مظفر آباد سہارنپور آمد کے موقع پر ان کے استقبال میں جو کلمات تحریر کئے تھے، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

آپ ایک علمی خانوادے کے چشم وچراغ ہیں، بزرگوں سے نسبت حاصل ہے، ندوۃ العلماء لکھنؤ اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جیسے عالمی اداروں سے فیض یافتہ ہیں، آج کل کناڈا کی سرزمین کو اپنے علمی چشمے سے سیراب کر رہے ہیں، علم وہدایت کی قندیلیں اور شمعیں روشن کئے ہوئے ہیں اور غیر مسلموں کی بنجر زمین کی اپنی معرفت اور نور ایمان سے ضیاء پاشی کر رہے ہیں، آپ کی شخصیت ہر مکتب فکر کے لوگوں کے نزدیک قابل احترام ہے، آپ کی مرنجا مرنج طبیعت اور رواداری نے ہر ایک کے یہاں یکساں مقبولیت حاصل

کررکھی ہے، آپ کے اندر سب کو ساتھ لیکر چلنے کی بھر پور صلاحیت ہے اور سب کو اپنا بنانے کے ہنر سے بخوبی واقف ہیں، اس لئے آپ کے فیض سے ایک عالم فیضیاب ہورہا ہے، اسی طرح ہندوستان میں بہت سے اداروں کی سر پرستی فرمارہے ہیں، خاص طور سے ابنائے ندوہ جیسی فورم کی صدارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں، سعودی عرب میں بھی بیس سال تک اپنا فیض پہنچا چکے ہیں، گویا کہ آپ اسم بامسمی سعید فیضی ہیں، یہ سعادت آپ کے رگ وپے میں سمائی ہوئی ہے، اور فیضی ہونے کا لازمی نتیجہ فیض ہی فیض ہے، اللہ تعالی آپ کی سعادت کو باقی رکھے، اور آپ کے فیضان کو جاری وساری رکھے۔

آپ کی شخصیت دینی وعلمی حلقوں میں معروف ہے، برصغیر ہند ہی نہیں بلکہ براعظم امریکہ میں بھی آپ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، کیونکہ آپ کی ذات کبر ونخوت سے پاک اور اخلاق فاضلہ اور صفات حمیدہ سے متصف ہے، سادگی آپ کی پہچان، تواضع وانکساری آپ کی نمایاں صفت ہے، اخلاص وللّٰہیت اور چھوٹوں پر شفقت آپ کا طرۂ امتیاز ہے، نیز آپ کی ذات دینی وعلمی کاموں میں مشغول رہتی ہے، اور آپ کو ہمہ وقت یہ فکر لاحق رہتی ہے کہ کس طرح مدارس اسلامیہ اور دینی ادارے ترقی کی راہ پر گامزن ہوں، گویا فتنوں کے اس پرآشوب دور میں آپ کی ذات بابرکت دوسروں کی خدمت کے لئے ہمہ وقت تیار رہتی ہے، اور زبان سے یہ کہتی ہے: ؎

بے جھجک میرے لہو کا قطرہ قطرہ کھینچ لو
اپنے اپنے زخم کا مرہم بنانے کے لئے

اس پرفتن دور میں دین کے کسی بھی شعبے سے تعلق وفکر مندی اور اس سلسلہ میں ادنی سے ادنی کوشش وجد وجہد بڑی اہمیت کی حامل اور اللہ کے نزدیک بہت ہی اجر وثواب کی مستحق ہے، اس وقت اسلام پر اور راہل اسلام پر خاص طور سے اسلامی قلعوں (دینی

مدارس) پر غیروں کی طرف سے جو یلغار ہے وہ ظاہر ہے، اپنوں کی طرف سے بھی کچھ کم یورش نہیں، قدم قدم پر الجھنیں، روکاوٹیں اور پریشانیاں درپیش ہیں، اللہ ہی حفاظت فرمائے، اس وقت قوم وملت کو آپ جیسے غیور، فکرمند، خلیق، مدبر، مخلص، باہمت وباتوفیق افراد کی ضرورت ہے، جن کے دلوں کی دھڑکن، نالہ نیم شبی، آہ سحرگاہی، دنوں کی تپش، شبوں کا گداز اور ہر وقت فکرمندی، اسلام کی اشاعت وحفاظت اور اہل اسلام کی ترقی وبہبودی اور امت کی اصلاح وفلاح کے لئے وقف ہے۔

مولانا سید عبدالرشید صاحب ندوی لکھتے ہیں:

جناب مولانا سعید الرحمٰن فیضی ندوی کی شخصیت محنت ذہانت، جدوجہد اور عمومی رابطے سے عبارت ہے، انہوں نے اپنی زندگی دعوت حق اور عوام کی فلاح وبہود کے لئے وقف کردی ہے اور امت مسلمہ کے لئے کامیابی وکامرانی کی تڑپ تو انہوں نے اپنے اجداد سے وراثت میں پائی ہے۔

ان کی طبیعت میں اپنی قوم کے لئے کچھ کرگزرنے کی لگن اور خوب سے خوب ترکی تلاش ان کو سعودی عرب کے ریگستانوں اور خارزاروں سے گزارتی ہوئی کناڈا میں لے گئی جہاں وہ کئی سال سے اپنے مادر علمی دارالعلوم ندوۃ العلماء سے علم دین کی حاصل کی ہوئی بیش بہا دولت لٹا رہے ہیں، ان کا محبوب مشغلہ قرآن وحدیث کی تدریس ہے، وہ علم دین کے متلاشی اور تشنہ لبوں کو ہمہ وقت سیراب کرتے نظر آتے ہیں۔

حدیث وتفسیر کی تدریس کے ساتھ وہ جمعیۃ العلماء کنیڈا کے رکن، نیز ہلال کونسل کینڈا اور امام کونسل کے ممبر ہیں، ان سب کے ساتھ ساتھ فروغ تجارت اور مائیکروکمیونکیشن کے منیجر کے عہدہ پر فائز اور گرین ہاوسنگ کے ڈائیریکٹر بھی ہیں اور ’’الندوہ ایجوکیشنل اسلامک سینٹر‘‘ کناڈا کے مؤسس وبانی بھی۔

خالد محبوب

مولانا مرحوم کے دوسرے بیٹے خالد محبوب نے بھی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں حفظ قرآن مکمل کیا اور درجہ ششم عربی تک دارالعلوم میں تعلیم پانے کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے عالم، فاضل، بی اے، اور ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں اور طویل مدت سے جدہ ریڈیو پر اناؤنسری اور ترجمانی کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں، خالد محبوب صاحب اپنا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

گلستان ازہری کا دوسرا بیٹا میں خالد محبوب ہوں، خاندانی روایت کہ مطابق تعلیم کا آغاز حفظ قرآن سے ہوا، پھر ندوۃ العلماء میں تعلیمی سلسلہ جاری رہا، قابل ذکر بات یہ ہے کہ بڑے بھائی مولانا سعید الرحمٰن اور ہم دونوں ہم سبق رہے، کسی حادثہ کی بنا پر میں نے درجہ ششم سے ندوہ چھوڑا، لیکن قلبی تعلق ہنوز باقی ہے، استاذ مکرم ناظم صاحب سے جب میں ہندوستان جاتا ہوں ضرور ملتا ہوں۔

مسلمانوں کی تعلیم پر نظر رکھنے والے اہل علم و دانش کی بصیرت نے کئی یونیورسٹیوں میں دینی درس گاہ سے فارغ التحصیل طلباء کیلئے ایک راہ نکال دی ہے، لہٰذا لکھنؤ یونیورسٹی میں اورینٹل اسٹڈیز کا شعبہ ہے، جہاں ایک ایک سال کا عالم وفاضل اور ادیب ماہر اور ادیب کامل کا کورس مکمل کرنے کے بعد BA میں داخلہ مل جاتا ہے، اس طرح BA اور MA کیا اور پی ایچ ڈی میں داخلہ لے لیا جو نامکمل رہی اور 1983 / جنوری میں سعودی عرب آگئے، والدین کی دعاؤں سے سعودی ریڈیو کی اردو سروس میں اناؤنسر کی حیثیت سے کام شروع کیا، متعدد پروگرام پیش کئے اور تادم تحریر نائب صدر شعبہ اردو ہوں، میری نرینہ اولاد دو ہیں اور دو بیٹیاں ہیں، بڑی بیٹی کی شادی ہوگئی ہے، تعلیم: MBA ہے اور آسٹریلیا میں مقیم اور نیشنل بینک میں ملازم ہے، دوسرے نمبر پر بیٹا عمر خالد ہے، دہلی سے B-Tech

کیا اور سائبر سکورٹی انجینئر ہے، سعودی عرب کی ایک کمپنی میں ملازمت کے فرائض انجام دے رہا ہے، تیسری بیٹی ڈینٹسٹ ہے اور چوتھا بشار ہے، چاروں بچوں کی ابتدائی تعلیم سعودی عرب میں انڈین ایمبیسی اسکول میں ہوئی، پھر مزید تعلیم کیلئے ہندوستان گئے، سوائے بشار کے، انہوں نے گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن آسٹریلیا کی وکٹوریہ یونیورسٹی سے کیا ہے۔

ماں کی تربیت نے بزرگوں کا احترام اور صوم وصلوۃ کا پابند بنایا ہے، اللہ کا شکر اور احسان ہے کہ موجودہ دور میں بھی بچے والدین عزیز واقارب اور احباب کا قابل قدر احترام کرتے ہیں، قارئین سے گزارش ہے کہ وہ میرے اور میری ذریت کی استقامت دین اور آخرت میں کامیابی کیلئے دعا کریں، آمین۔

اسعد محبوب

مولانا مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے اسعد محبوب نے لکھنؤ میں ہائی اسکول اور سائنس کے سبجیکٹ میں انٹرتک پڑھنے کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی سے میکانیکل انجینئرنگ کا کورس کیا اور کئی سال تک جگادھری (ہریانہ) اور پونے میں بحیثیت انجینئر مختلف کمپنیوں میں ملازمت کی، ادھر چند برسوں سے بھوپال میں ایک فرم Namtel Techonlogies قائم کیا اور خوش حالی کی زندگی گزار رہے ہیں، اسعد محبوب صاحب اپنا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں والد صاحب کا سب سے چھوٹا بیٹا ہوں اور سب سے چہیتا اور لاڈلا بھی، بچپن سے ساتھ رہے، میری پڑھائی لکھنؤ میں ہوئی، میں بارہویں کے بعد انجینئرنگ میں داخلہ لیا اور جامعہ ملیہ سے انجینئرنگ کی، اس کے بعد جگادھری اور پونہ میں ملازمت کی، میری شادی لکھنؤ ملیح آباد میں ہوئی، میری بیوی ادیب حسن صاحب کی صاحبزادی ہے، جو ایک زمین دار تھے، جن کے آم کے باغات بھی ہیں، ۲۰۰۰ء میں شادی ہوئی تھی، اس کے بعد میں نے

بھوپال میں سکونت اختیار کی، بھوپال میں ہی اپنا کاروبار شروع کیا، پہلے ٹیلی کام کا موبائل ٹاورس اور جو آپٹیکل فائبرس کیبلینگ کا کام ہوتا ہے اس کو شروع کیا، پھر اور کچھ چیزوں میں گئے، پھر شولر پلانٹ، اور ابھی تقریباً ۲۰ر سال سے الگ الگ طرح کے پروجیکٹ کر رہے ہیں، جس میں ابھی شولر کے علاوہ بڑے ترمل پلانٹ کا کام شروع کیا، میرے دو بچے ہیں، بڑی بیٹی جس کا نام آمنہ ہے، جس نے ٹویلو پاس کیا ہے، ماشاءاللہ ۹۰ر پرسنٹ ریزلٹ آیا، اور چھوٹا بیٹا ہے، جس کا نام یوسف ہے، اور میری اہلیہ کا نام نائلہ ہے۔

باقی والد صاحب سے ایسا گہرا تعلق تھا، جو ایک بیٹے کا باپ سے ہونا چاہئے اس لئے آخری سالوں میں میرے ساتھ کافی رہے، چونکہ انہیں بھوپال اچھا لگتا تھا اور ابھی جو میں نے مکان بنوایا ہے، یہ انہی کا پسند کیا ہوا تھا، انہوں نے اس کو فائنل کیا تھا کہ یہ اچھی جگہ ہے، اب میں اس مکان میں شفٹ ہو گیا ہوں، والد صاحب کے بارے میں آپ تو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں، لیکن اولاد کے تعلق سے بہت ہی سادہ مزاج تھے اور کسی چیز میں روکاوٹ نہیں بنتے تھے، زیادہ مسئلے مسائل نہیں، سادگی کے ساتھ زندگی گزارنا ان کا شیوہ تھا، کسی چیز میں شدت پسندی نہیں تھی، بہت ہی اطمینان سے اپنا کام کرتے تھے، اگر کوئی مسجد میں مسئلہ لیکر آتا تو اس سے کہتے کہ یہ مسجد نماز کی جگہ ہے، یہ مسئلہ کی جگہ تھوڑی ہے، اگر امام کے پیچھے نماز پڑھنا ہے تو جیسے انہوں نے کہا ہے ویسے ہی پڑھ لو، اس طرح سے وہ ہم لوگوں کو بھی سمجھاتے تھے کہ اگر کوئی مسئلہ ہے تو اس کو زیادہ لمبا مت کھینچو، ختم کردو، اگر ہوسکتا ہے تو سامنے والے کے حق میں تھوڑا سا کردو، تو مسئلہ بہت جلدی سلجھ جائے گا اور حل ہو جائے گا، اس کا ہم نے اپنی عملی زندگی میں بھی بہت فائدہ اٹھایا کہ کاروبار کی نوعیت سے کبھی کبھی ایسے مسئلے آتے ہیں، پیسے کے معاملات میں تو کافی خرابیاں ہوتی ہیں، لیکن والد صاحب کی جو نصیحت تھی اس پر عمل کرتے ہیں تو بہت زیادہ فائدہ ہوتا ہے، میں سامنے والے کی بات کو مان کر کہہ دیتا ہوں کہ چلو آپ کی ہی بات صحیح ہے، میں تھوڑا سا جھک

جاتا ہوں تو اس کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ جھگڑے وغیرہ سے بچ جاتا ہوں، اور لوگ بعد میں عزت بھی دیتے ہیں اور بات بھی مانتے ہیں۔

یہاں پر والد صاحب کے نام پر زکوۃ کے نام سے ایک فاؤنڈیشن بھی بنایا ہے، وہ بھی چل رہا ہے، لکھنؤ میں بارہ بنکی کے پاس ان کے نام سے ایک مدرسہ بھی چل رہا ہے، اور انشاء اللہ ایک مسجد بھی تعمیر کروانی ہے، بھوپال میں اور اس کے اطراف میں ایک جگہ ہے، جہاں پر مسجد کی سخت ضرورت ہے، وہاں کے لوگ کہتے ہیں کہ ایک مسجد بنوا دیجئے اور اس کے ساتھ امام کی تنخواہ بھی تاعمر دینی ہوگی، یا ان کے روزگار کے لئے کوئی کام کیجئے، تو یہ اچھی مہم ہے، میں اس سے جڑا ہوا ہوں، اور اس سے کافی جگہ ہم لوگوں نے کام کیا ہے، ابھی لوک ڈاؤن کے وقت میں بھی ہم لوگوں نے خدمت کا کام کیا، اللہ تعالی نے ہمیں موقع دیا، جو لوگ مسافر تھے یا مقامی تھے جن کے پاس روزگار نہیں تھے یا روزگار ختم ہوگیا تھا، ہم نے انہیں کافی مدد کی، تقریباً تین ہزار لوگوں کو کھانا ہر روز تقسیم کیا، ایسے ہی جو لوگ ممبئی وغیرہ سے آ رہے تھے، جو پیدل یا سائیکل سوار یا ٹرک وغیرہ سے تھے سب کا تعاون کیا، یہ سب والد صاحب اور والدہ صاحبہ کی تربیت کا نتیجہ اور اثر ہے، جو اللہ تعالی نے دل میں ڈالا، ورنہ اکثر تو گھروں میں بیٹھ گئے تھے کہ وبا پھیلی ہے، پریشانیاں ہیں، باہر نہ نکلو؛ لیکن والد صاحب کچھ چیزوں میں بہت مضبوط تھے، کہنے کی بات ہوتی ہے کہ ایمان ہے، ایک عملی ایمان ہوتا ہے، تو عملی ایمان پر کر گزرتے تھے، ہم لوگ تو کہتے رہتے ہیں، جب کرنے کا وقت آتا، تو ہم پیچھے ہو جاتے ہیں، لیکن والد صاحب کا کہنا تھا کہ جب بھی کبھی موقع ہو تو پیچھے نہ رہو، جس میں عام طور سے مسلمان پیچھے رہتے ہیں۔

ہمارے والد صاحب کا یہ خاصہ تھا کہ وہ نیکی کے کام میں کبھی پیچھے نہیں رہتے تھے، ایسے ہی اگر کوئی سائل آ گیا، یا کوئی پڑوس کا مستحق آ گیا تو فوراً اس کو دیدیتے تھے، منع نہیں کرتے، ہم لوگ والد صاحب کو پیسہ بھیجتے تھے، لیکن بہت جلد ہی ختم کر دیتے تھے، تو ہم لوگوں کو

حیرت ہوتی تھی کہ اتنا پیسہ اتنی جلدی کیسے ختم ہوگیا، آخر ابا اتنا پیسہ کیا کرتے ہیں، لیکن بعد میں معلوم ہوا، اس وقت سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کتنی بڑی چیز ہے، کہ اگر آپ اس طرح سے اپنی زندگی گزاریں کہ اگلے پل کی نہیں سوچی، کس وقت ہماری زندگی ختم ہوسکتی ہے، لیکن ہم لوگ ایک پلاننگ کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں، کہ اب یہ کرنا ہے، اب وہ کرنا ہے؛ لیکن والدصاحب نے اپنی زندگی میں کبھی یہ نہیں سوچا، یہی والدہ کا طریقہ کار تھا۔

مولانا کی دوسری بیوی سے دو بیٹیاں

مولانا محبوب الرحمٰن کے داماد مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا مرحوم کی بڑی بیٹی رفعت محبوب راقم سطور کی شریک حیات اور ''مؤسسۃ القدس برائے فروغ حدیث وعلوم حدیث'' (مکہ گنج، نزد شیعہ پی جی کالج، سیتاپور روڈ، لکھنؤ) کی Managing Director ہیں، موصوفہ نے ۱۹۷۸ء میں کرامت گرلس کالج لکھنؤ سے فرسٹ ڈویزن سے گریجویشن پاس کیا، انہیں لکھنؤ میں رہنے کی وجہ سے اپنے والدین کی خدمت کا بھرپور موقع ملا''۔

مولانا مرحوم کی چھوٹی بیٹی عشرت محبوب راقم کے برادرزادے شاہد نعمانی (MBA ALIG) سے منسوب ہیں اور Sigma Telecommunication (بھوپال) کی Propriter ہیں، موصوفہ لکھنؤ یونیورسٹی سے (Org. Chemistry) میں Post Graduate ہیں، یہ دونوں بہنیں (رفعت اور عشرت) اعلیٰ عصری تعلیم حاصل کرنے کے باوجود نیکی ودینداری اور حسن اخلاق سے متصف ہیں، عشرت محبوب نے اپنے ایک بیٹے سید بلال نعمانی کو عصری تعلیم جاری رکھتے ہوئے کلام پاک حفظ کرایا اور اب وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں زیر تعلیم ہے اور ہر سال بلا ناغہ نماز تراویح میں کلام پاک سناتا ہے، وللہ الحمد علی ذلک۔

مولانا کے ایک داماد نامور مصنف اور محدث مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی ہیں، جو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے فارغ اور تادم تحریر ندوہ میں حدیث کے مقبول استاذ ہیں۔

اللہ تعالیٰ سب کو سلامت اور اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ آمین